حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مدارس اسلامیہ

اہمیت وضرورت اور مقاصد

سید احمد شہید اکیڈمی

مدارس اسلامیہ

اہمیت وضرورت اور مقاصد

مدارس اسلامیہ کا مقام ومرتبہ، معاشرہ میں اس کی اہمیت وافادیت،
اس کے خلاف ریشہ دوانیوں کے دفاع کی تدابیر، اس کی جانب
منسوب افراد کی کوتاہیاں اور ان کی ذمہ داریوں کا ایک جامع مرقع

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مرتب

عبدالہادی اعظمی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ - اگست ۲۰۱۲ء

کتاب	:	مدارس اسلامیہ - اہمیت وضرورت اور مقاصد
مصنف	:	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
ترتیب	:	عبدالہادی اعظمی ندوی
صفحات	:	۲۰۰
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
سیٹنگ	:	سید محمد مکی حسنی ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سید احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرست

اسلام کے قلعے

عربی مدارس: واجبات وفرائض

ایک مثالی درس گاہ

دینی وعربی مدارس کی خصوصیات اور ہندوستان کی تاریخ اور ثقافت میں ان کا حصہ

مدارس وجامعات کا بہترین تعارف

مدارس کے وجود کا مقصد

زبردست چیلنج اور دوررس نتائج کے حامل خطرات

اسلام کی حیات و بقا کے لیے مسلمانوں پر ذمہ داری

مدارس ومکاتب کا قیام سب سے ضروری چیز

مدارس و مکاتب سائنس کا حکم رکھتے ہیں!

امت کے تحفظ کا راستہ

مدارس اسلامیہ کی خصوصیات

مدارس امت مسلمہ کے لیے سرچشمۂ حیات ہیں

مدرسہ کیا ہے؟

گاؤں اور دیہات کے عربی مدارس

مدرسہ و مسجد۔ لازم وملزوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

''علم'' کے موضوع پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تقریروں اور قدیم تحریروں پر مشتمل جو مجموعے تیار کیے گئے ہیں، ان میں یہ دوسرا مجموعہ مدارس دینیہ کی اہمیت وضرورت اوراس کے مقاصد کے موضوع پر ہدیۂ ناظرین ہے۔

موجودہ دور میں ایک طرف مدارس کو ہدف ملامت بنایا جارہا ہے، ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے جارہے ہیں اوران کو نئے رنگ میں رنگنے کی دعوت دی جارہی ہے، اور دوسری طرف خود مدارس کے اندر زندگی اور روح کا فقدان بڑھتا چلا جارہا ہے، ایسے حالات میں حضرت مولاناؒ کی فکرودرد میں ڈوبی ہوئی یہ تقریریں ایک طرف تمام اہل مدارس کے لیے ایک لائحۂ عمل ہے، تو دوسری طرف ان پر اعتراض کرنے والوں کا اس میں پورا جواب بھی ہے، جو مدارس کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اوران کی طرف سے مدارس کو نئے رنگ میں رنگنے کی پرزور دعوت دی جاتی رہی ہے۔

مکہ مکرمہ میں ''دارارقم'' اور مدینہ طیبہ میں ''صفہ نبوی'' کے نام سے جو سلسلہ خود رسول اکرم (ﷺ) نے شروع فرمایا تھا، درحقیقت یہ مدارس اسی کا امتداد ہیں، اوران سے نسبت ان مدارس کے لیے صرف باعث فخر ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کا راز ہے، اوراسی سے ان کے اندر روح باقی ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان تقریروں اور تحریروں میں ان مدارس کی اہمیت و

افادیت بھی بتائی ہے، ان کا کام بھی بتایا ہے، ان کے داخلی و خارجی فرائض بھی گنائے ہیں، ان کے مقصد کا تعین بھی کیا ہے، طلبہ کے اندر افسردگی اور بے کیفی کے اسباب بھی بتائے ہیں اور ان کا علاج بھی تجویز کیا ہے۔ ایک مثالی درس گاہ کو کن صفات سے آراستہ ہونا چاہیے، اور ان مدارس کی خصوصیات کیا ہیں، اور ہندوستان کی تاریخ و ثقافت میں ان کا حصہ کیا ہے، یہ سب وہ موضوعات ہیں جب پر سیر حاصل بحث ناظرین اس کتاب میں پائیں گے۔

مركز الإمام أبي الحسن الندوي کے ذمہ یہ ایک قرض تھا جو ادا کیا جارہا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی غیر مطبوعہ یا قدیم مطبوعہ تقریریں اور تحریریں جو قدیم رسائل کی شکل میں تھیں، ان کو جمع کر کے مرتب کرنے کا کام جس طرح عزیز القدر مولوی عبد الہادی اعظمی ندوی سلمہ نے کیا ہے وہ اس پر مبارکباد کے مستحق ہیں، علم کے موضوع پر تقریباً چھ کتابیں تیار ہیں، اس کے علاوہ بھی متعدد موضوعات پر خاصا کام ہو چکا ہے، امید ہے کہ ان شاء اللہ ان کی طباعت کا سلسلہ جاری رہے گا، طباعت کی ذمہ داری عزیز القدر مولوی محمد نفیس ندوی سلمہ نے سنبھالی، اللہ تعالیٰ سب حصہ لینے والوں کو اجر عطا فرمائے، اور اس کتاب کو خاص طور پر اہل مدارس کے لیے مفید بنائے، اور مدارس میں روح پیدا ہونے کا ایک ذریعہ فرمائے۔

بلال عبد الحی حسنی ندوی

دار عرفات، مركز الإمام أبي الحسن الندوي

۱۸ ر رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ

۷ ر اگست ۲۰۱۲ء

اسلام کے قلعے

عربی دینی مدارس کی ضرورت کیوں؟

جدید اجتماعی وسیاسی تغیرات نے بہت سے قومی و مذہبی مسائل کو موضوع بحث بنا دیا ہے، اور زندگی کے بہت سے شعبوں اور اداروں کی ضرورت اور فائدہ پر بحث وتنقید کا دروازہ کھل گیا ہے، مسلمانوں کے بعض حلقوں میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ عربی مدارس کی اس انقلابی زمانہ میں کیا ضرورت ہے اور ان کے نہ ہونے سے ہماری زندگی کا کون سا خانہ خالی رہتا ہے؟ آج کی صحبت میں ہم اسی سوال کے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

مذہب امت مسلمہ کے خمیر اور ترکیب میں داخل ہے

اس سلسلہ میں چند بنیادی حقائق کا سمجھ لینا ضروری ہے، جو اس مسئلہ میں مبادی کا کام دیں گے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ مسلمان قوم کا مزاج اور قوام دنیا کی تمام قوموں سے مختلف ہے۔ مذہب ''امت مسلمہ'' کے خمیر اور ترکیب میں داخل ہے۔ یہ قوم کسی جگہ اور کسی وقت بھی غیر مذہبی نہیں ہو سکتی، بلکہ مذہب اور ایک متعین مذہب (اسلام) کے بغیر اس کا تصور ہی ممکن نہیں۔ مذہب اس کے فکر وعمل کا مرکز، اس کے کاموں کی صحت و غلطی اور اس کی ترقی وتنزل کی میزان اور اس کی صحت طبعی اور اور انحراف مزاج کا مقیاس ہے۔

امت مسلمہ کی زندگی اور فکر کا سر چشمہ وحی الٰہی ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اس امت کی بنیاد ایک خاص قانون (شریعت) اور ایک خاص

دستور (قرآن وحدیث) پر ہے۔ یہ قانون مکمل اور یہ دستور منضبط ہے۔ اس امت کو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی زندگی اور فکر کا سرچشمہ تغیر پذیر انسانی اجتہادات و تجربات اور غیر قطعی نظریات کے بجائے وحی الٰہی ہے۔ دنیا کی دوسری تہذیبوں کے برخلاف اس کی تہذیب وتمدن کی بنیاد دیواروں اور ستونوں، میناروں اور گنبدوں، کاغذ کے شیرازوں، تصویروں کے نقوش اور موسیقی کے آلات پر نہیں ہے، بلکہ چند ابدی حقائق، چند اصول ونظریات اور اس مخصوص اخلاقی فلسفہ پر ہے جو وحی سے ماخوذ اور اس کا پیدا کیا ہوا ہے۔ دنیا کی دوسری ''خودرو'' اور ''خودساختہ'' قوموں کے برخلاف اس کے مستقبل کی بنیاد اس کے ماضی پر ہے۔ اس کے سامنے زندگی کا ایک بلندترین معیار اور ترقی کا آخری نمونہ ہے، اور یہ نمونہ گزر چکا ہے، لیکن تاریخی وتحریری طور پر محفوظ ہے۔ یہ سنت رسول (ﷺ)، اسوۂ صحابہؓ اور خلافت راشدہ کا عہد ہے۔ ''سنت'' اور ''سلف'' کی جو اہمیت اسلامی تعلیمات میں ہے، غالباً کسی دوسرے مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔

اسلام میں دین کے مفہوم کی وسعت وہمہ گیری

یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ دین کا مفہوم جتنا اسلام میں وسیع اور ہمہ گیر ہے، کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے، بلکہ اگر دیکھا جائے تو اسلام کے صحیح نقطۂ نظر اور تعلیمات نبوی کے مطابق سچے مسلمان کی پوری زندگی دین ہے، اور نیت کے تغیر سے اس کا ہر کام عبادت ہے۔ اس لیے اس میں دین ودنیا کی وہ تقسیم نہیں ہے جو مسیحی مذہب میں ہے۔ نہ دین ودنیا کے شعبے اور ان کے اشخاص اس طرح علاحدہ علاحدہ اور ان کے حدود ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں جس طرح عیسائیوں میں۔ مذہب مسلمان کی زندگی میں جلد مؤثر ہوتا ہے، اور جلد متاثر۔ اگر اس کی زندگی کے مسائل نہایت ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ دین کی روشنی میں اور اس کی مصالحت اور سمجھوتہ سے طے نہ کیے جائیں تو نہایت آسانی سے وہ دین سے ٹکرا جاتے ہیں، اور مسلمان کی زندگی اور اس کے مذہب پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر صلح وجنگ کے قوانین، تعزیرات، لین دین کے معاملات اور کتنے اجتماعی ومعاشرتی،

سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن کا مذہب سے گہرا تعلق اور اسلامی قانون سے ارتباط ہے۔ ان مسائل کو طے کرنے کے لیے کتنی دینی بصیرت اور کس قدر علم کی ضرورت ہے۔!!

جس قوم کا مزاج اتنا نازک اور پیچیدہ ہو، اور جس کے مذہب و قانون کا دائرہ اتنا وسیع ہو، اس کے علاج و طبی مشورہ کے لیے کیسے مزاج داں و نباض اور کیسے حاذق کی ضرورت ہے۔!!!

جو طبقہ یا جماعت مسلمانوں کی رہنمائی کے منصب کی اُمید وار ہو، اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے قانون اور دستور سے واقف ہو۔ اس سرچشمہ سے سیراب ہو، جس سے اس کی زندگی کی نہریں پھوٹی ہیں اور اس کی رگوں میں اس کا آب حیات جاری ہے۔ ان ابدی حقائق کا علم اور ان اصول و نظریات پر یقین رکھتا ہو، اور اس اخلاقی فلسفہ کا قائل اور حامل ہو جس پر اس کے تمدن و تہذیب کی بنیاد ہے۔ اس کے ماضی سے باخبر اور اس بلند معیار اور نمونہ سے متاثر ہو جس پر امت کے حال و مستقبل کی تعمیر ہونی چاہیے۔

امت کا سب سے بڑا فریضہ

اس سلسلہ میں ایک اور حقیقت سمجھ لینی چاہیے، اسلام دراصل نام ہے اس مستقل واضح اور متعین دینی، اخلاقی اور اجتماعی نظام کا جو محمد رسول اللہ (ﷺ) دنیا میں لے کر آئے۔ اسی کا نام شریعت محمدی ہے۔ اس میں عقائد بھی ہیں، اعمال، اخلاق و معاملات بھی۔ باقی جو کچھ ہے یا اس کے لیے وسیلہ ہے یا اس کا نتیجہ۔ امت کا سب سے بڑا فریضہ اس نظام کی حفاظت ہے، عقائد کی حفاظت بھی ضروری ہے، اور احکام کی حفاظت بھی۔ ضرورت ہے کہ عقائد ان تمام تحریفات سے محفوظ رہیں جو دوسرے مذاہب میں پیش آئیں، اور جن کا اس امت میں بھی ہر وقت خطرہ ہے۔ ضرورت ہے کہ نبوت محمدی نے ذات و صفات باری تعالیٰ، توحید و رسالت، قضا و قدر، حشر و نشر، امور غیب اور وحی کے متعلق جو تشریح کی ہے، اور ان کے جو حدود قائم کیے، وہ باقی رہیں۔ اس لیے کہ ان تمام مسائل کی بنیاد قیاس و تخمین پر نہیں، بلکہ وحی و نبوت پر ہے، اور نبوت محمدی نے اس کی تکمیل کر دی ہے۔

احکام پر عمل اسی طرح ہو جس طرح آنحضرت (ﷺ) نے کیا اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ہوا، شرعی احکام و عبادات میں ترمیم و اضافہ (بدعت) سے مذہب کو محفوظ رکھا جائے۔ پرانے آسمانی مذاہب ان بدعات کی وجہ سے اس طرح مسخ ہوئے کہ اب ان کے انبیاء کے لیے ان مذاہب کا پہچاننا ناممکن ہے۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ ان عقائد و احکام کی برابر اشاعت و تعلیم ہوتی رہے، اس لیے کہ دین کی بقا اسی پر منحصر ہے۔

اس کے علاوہ امت محمدی کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا میں بھلائی کی تلقین (امر بالمعروف) اور برائی کی ممانعت (نہی عن المنکر) کرتی رہے، ایک آیت میں امت کی پیدائش و ظہور کا مقصد بتایا گیا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ [سورة آل عمران: ۱۱۰] ''تم سب امتوں سے بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی، اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو، اور برے کاموں سے منع کرتے ہو، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔''

لیکن یہ امت کا بحیثیت مجموعی فریضہ ہے، اگر اس میں سے ایک معتد بہ جماعت یہ فرض انجام دے تو گویا پوری امت یہ فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اس لیے دوسری آیت میں امت کے ایک بڑے گروہ کا جس پر خود امت کا اطلاق ہو سکے، یہ فریضہ بتایا گیا ہے، مگر اس ''امت صغریٰ'' کا پیدا کرنا اور اس کو اس کا موقع دینا خود ''امت کبریٰ'' کا فرض قرار دیا گیا ہے، فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [سورة آل عمران: ۱۰٤] ''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔''

اس تقسیم عمل کے اصول کو یہ آیت اور زیادہ واضح کرتی ہے:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ

لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوآ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ [سورة التوبة:۱۲۲] ''اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں، تو یوں کیوں نہ کریں کہ ہر جماعت میں سے چند اشخاص نکل جائیں، تا کہ دین کا علم سیکھیں اور اس میں سمجھ پیدا کریں، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو ان کو خوف دلائیں، تا کہ وہ کچھ خوف کریں۔''

نہایت آسانی سے فیصلہ کیا سکتا ہے کہ مندرجۂ بالا فرائض نظام شرعی کی حفاظت، عقائد واحکام کو اپنے مقام پر رکھنا اور ان کو تحریف و بدعات سے بچانا، شریعت کی اشاعت و تعلیم اور تبلیغ و اصلاح کے فرائض قوم کا کون سا طبقہ انجام دے سکتا ہے۔!!

اسلام کے نظام شرعی کی حفاظت کون کر سکتا ہے؟

اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کے نظام شرعی کی حفاظت اور اس کے لیے ایثار و قربانی صرف وہ طبقہ کر سکتا ہے جس کی ذہنی اور عملی تربیت اس کے موافق ہوئی ہو، جس کے رگ و ریشہ میں اس نظام کی محبت اور اس کا عشق و احترام پیوست ہو گیا ہو، اور جس کے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اس کا یقین اتر گیا ہو۔ اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ جب اس نظام پر کوئی ضرب لگائی گئی، یا اس کے خلاف کوئی سازش کی گئی، تو ہمیشہ یہی طبقہ بے چین ہوا، اور سر سے کفن باندھ کر میدان میں اتر آیا۔ حضرت حسینؓ، زید شہیدؒ، محمد ذوالنفس الزکیہؒ، ابراہیم بن عبداللہؒ کی قربانیاں اور سرفروشی، اور اموی و عباسی محرّف نظام سلطنت کے خلاف تحریک جہاد اسلامی نظام کی حفاظت کی کوششیں ہی تھیں۔ پھر ان خونیں معرکوں کے مظلوم شہداء اگر عالم کہلانے کے مستحق نہیں تو روئے زمین پر پھر عالم دین کہلانے کا مستحق کون ہے؟ ان کے حامیوں اور مددگاروں میں بھی سر فہرست نام امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔

جب عباسی سلطنت کی طرف سے امت پر جبریہ خلق قرآن کا عقیدہ مسلط کیا جانے لگا، تو اس خطرناک تحریف و الحاد اور اس غیر اسلامی عقیدہ کے خلاف وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی کے مقابلہ میں حفاظت دین کے لیے جو شخص تن تنہا میدان میں آیا، وہ جماعت علماء کا ممتاز فرد امام احمد بن حنبلؒ تھا، جس کے عزم و استقامت اور ایمان کے سامنے حکومت

وقت کو جھکنا پڑا، اور یہ عقیدہ تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو اس کا مطلب بھی سمجھتے ہیں؟

تیسری صدی کے آغاز میں جب عباسی سلطنت کی غفلت سے بغداد میں سخت ابتری، فسق و فجور اور بدامنی پھیلی، تو دو عالموں خالد الدریوش اور سہیل بن سلامۃ الانصاری نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور قوت و جمعیت کے ساتھ "مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ"[1] پر عمل کرنا شروع کر دیا، جس کی پاداش میں وہ دونوں گرفتار ہوئے اور قید کر دیے گئے۔[2]

بعد کے زمانے میں دو جلیل القدر عالم حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور امام ابن جوزیؒ نے اسلامی نظام اخلاق کی حفاظت اور مسلمانوں کی روحانی و دینی اصلاح کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں، ان کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد اسلامی نظام کو اپنے مرکز پر لانے کے لیے، عقائد کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تفہیم اور صحابہؓ کے فہم کے مطابق سمجھنے کے لیے امام ابن تیمیہؒ نے جو علمی و عملی خدمات انجام دیں، وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔

ہندوستان میں تجدیدی و اصلاحی کام

ہمارے ہندوستان میں اسلام کے نازک ترین دور میں جب (مؤرخ اسلام کے الفاظ میں) ''عجم کے ایک جادوگر نے بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہوگئی، اب وقت ہے کہ ایک شہنشاہ امی کے ذریعہ نبی اُمی (علیہ الصلاۃ و السلام) کا دین منسوخ ہو کر دین الٰہی کا ظہور ہو، مجوسیوں نے آتش کدے گرمائے، عیسائیوں نے ناقوسیں بجائیں، برہمنوں نے بت آراستہ کیے اور جوگ و تصوف نے مل کر کعبہ اور بت خانے کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا،''[3] تو جو مسلمان مجاہد اس ''فتنۂ اکبر'' کے مقابلہ کے لیے میدان میں آیا اور جس نے سلطنت مغلیہ کا رخ ہی بدل دیا، اور جس کی عہد

---

(۱) رواہ مسلم في كتاب الإيمان، باب كون النهي عن المنكر من الإيمان، حديث رقم: ۱۷۷

(۲) ملاحظہ ہو: طبری جلد ۱۰ ص ۲۴۱، مقدمہ ابن خلدون ص ۱۳۴

(۳) مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ از سید سلیمان ندویؒ

آفریں تحریک اور انقلاب انگیز تجدید نے اکبر کے گھرانے میں عالمگیر جیسا متشرع فرمانروا اور حامی دین پیدا کیا، وہ علماء ہی کا سرتاج مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ تھا، رحمہ اللہ۔

اس کے بعد آج اس وقت تک ان عجمی دیار میں اس غریب الوطن عربی مہمان کی جس نے سرپرستی اور حفاظت کی اور ہوا کے طوفانوں میں اس چراغ کو جو بارہا چراغ سحری بنا، گل نہ ہونے دیا، وہ علمائے دہلی کا مشہور بابرکت خاندان ہے، جس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنے مجددانہ علمی کارناموں اور ان کے پوتے شاہ اسماعیل شہیدؒ اپنی قربانی اور سرفروشیوں کی بنا پر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ بھی حفاظت دین، ردّ بدعات، اصلاح رسوم اور الحاد و زندقہ کے مقابلہ کا جتنا کام اس وقت تک ہوا اور اس وقت بھی ہو رہا ہے، وہ سراسر اسی طبقہ سے ہو رہا ہے۔

مدارس دینیہ کی ضرورت

اگر دین اور اس کے شرعی نظام کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کو محض ایک قوم بن کر نہیں، بلکہ ایک صاحب شریعت و کتاب قوم بن کر رہنا ہے، تو مذہب کے محافظین و حاملین اور شریعت کے ترجمان و شارحین کی ضرورت ہے، اور اگر ان کی ضرورت ہے تو لامحالہ ان مرکزوں اور اداروں کی ضرورت ہے جو ایسے اشخاص پیدا کر سکتے ہیں، اور یہ ضرورت مسلمانوں کی ہر قومی ضرورت سے اہم ہے۔

خلافت راشدہ کے طرز کی اسلامی سلطنت میں بھی دینی مدارس اور تربیت گاہوں کی ضرورت ہے، تاکہ امت کے اسلامی جسم میں ہر دم تازہ خون پہنچتا رہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ جس نظام کی پشت پر ایسا ادارہ یا تربیت گاہ نہ ہو جو اس قسم کے اشخاص پیدا کرتا رہے جو اس نظام کو چلا سکیں، اگلوں کی جگہ لے سکیں اور اس مشین میں فٹ ہو سکیں، اس نظام کی جڑیں ہمیشہ کھوکھلی اور اس کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے۔

اگر برائے نام اسلامی سلطنت بھی ہے تو بھی ایسے اداروں کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے ذمہ دارانہ عہدوں کے لیے دیندار، امین اور مسلمانوں کی ضرورت سمجھنے

والے کارکن مل سکیں۔

لیکن اگر کسی اسلامی ملک میں بدقسمتی سے اسلامی حکومت نہ ہوتو وہاں ایسے اداروں کی ضرورت شدید تر ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی جماعت کسی صحیح اسلامی حکومت کی کچھ نہ کچھ قائم مقامی کرسکتی ہے، اور حفاظت دین کا فرض انجام دے سکتی ہے، تو وہ صرف جماعت علماء ہے۔ چنانچہ اسی نکتہ کی وجہ سے اسلامی سلطنت کے زوال کے وقت حضرت شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) اور ان کے خاندان نے اسلامی تعلیم اور دینی درس وتدریس کا نظام قائم کیا، جس نے بڑی حد تک ایک اچھی اسلامی ریاست کی دینی ضرورتیں پوری کیں۔ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ عملی حیثیت سے اسلام ہندوستان میں ان ممالک سے بہتر حالت میں ہے جہاں برائے نام اسلامی سلطنت موجود ہے، مگر دینی آزاد مدارس کا کوئی نظام یا خاندان ولی اللّٰہی کی شان کے علماء نہیں پیدا ہوئے۔

جب ہندوستان میں حکومت مغلیہ کا چراغ گل ہوگیا اور مسلمانوں کا سیاسی قلعہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تو بالغ نظر اور صاحب فراست علماء نے جابجا اسلام کی شریعت وتہذیب کے قلعے تعمیر کردیے، انھیں قلعوں کا نام ''عربی مدارس'' ہے، اور آج اسلامی شریعت و تہذیب انھیں قلعوں میں پناہ گزیں ہے اور اس کی ساری قوت واستحکام انھیں قلعوں پر موقوف ہے۔[1]

---

(۱) ماخوذ از ماہنامہ ''الندوہ''، لکھنؤ (شمارہ مئی ۱۹۴۰ء) اور ''اسلام کے قلعے اور علمائے ربانی کی ذمہ داریاں'' (ص ۷-۱۷)۔

عربی مدارس - واجبات وفرائض

تنازع للبقاء اور بقائے اصلح کا قانون

ربیع الآخر کے ''الندوہ'' میں اسلامی قلعوں کے عنوان سے عربی مدارس کی اہمیت اور ضرورت پر کچھ عرض کیا گیا تھا، لیکن کسی ادارہ کے قیام وبقا کے لیے یہی کافی نہیں کہ اس کے بنیادی مقاصد نہایت اہم اور ضروری ہیں، اس کی سابقہ خدمات نہایت شاندار ہیں، اور مستقبل میں اس کے بڑے اچھے ارادے اور نیک نیتیں ہیں۔ یہ زمانہ ''تنازع للبقاء'' کا ہے اور تنازع بھی صرف مادی وجسمانی نہیں، بلکہ ذہنی، اجتماعی اور اخلاقی تنازع بھی۔ خیالات و افکار، نظریات ورجحانات، نقطہائے نظر، حلقہائے فکر، مختلف اخلاقی فلسفے، مختلف اجتماعی مسلک، مختلف سیاسی نظریے، مسلسل آویزش اور مقابلہ میں ہیں۔ زندگی میں اپنی شایان شان جگہ حاصل کرنے کے لیے زندہ اشخاص کو بھی اور بامقصد اداروں کو بھی سخت کشمکش اور جد وجہد کی ضرورت ہے، اور ''بقائے اصلح'' کا قانون ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی جاری ہے۔

عربی مدارس کا مقصد

عربی مدارس کے وہ بلند مقاصد جن کو ہم نے اپنے پہلے مضمون میں اختصار سے بیان کیا ہے، اور جن کو اس سے زائد اختصار کے ساتھ دو لفظوں میں ''نیابتِ انبیاء'' سے ادا کیا جاسکتا ہے، کچھ پیغمبروں ہی کی سی جدوجہد اور قربانی چاہتے ہیں۔ حدیث ''اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ ''(۱) کو حدیث ''إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ''(۲) کے

(۱) أخرجه البخاري في التاريخ الكبير، والترمذي في جامعه، حديث رقم: ۲۶۸۲

(۲) رواه النسائي في السنن الكبرى، حديث رقم: ۷۴۸۲

ساتھ ملا کر پڑھیے۔ اشخاص کے فرائض اداروں میں شریک ہو کر ختم نہیں ہوتے، بلکہ کچھ بڑھ جاتے ہیں، ادارہ نام ہے ''منتشر اشخاص کی ہیئت اجتماعیہ'' کا۔ اس لیے جو فرائض اشخاص کے ہیں، وہ ان کے مجموعہ کے بھی ہیں۔

مدارس کے فرائض

مدارس کے کچھ فرائض اندرونی ہیں، کچھ بیرونی۔ اندرونی سے مراد وہ کام ہیں جو مدارس عربیہ کے اصحاب اور معلمین کو مدرسہ کے اندر انجام دینے چاہییے۔ بیرونی سے مراد وہ خدمات ہیں جن کا تعلق مدارس کی چار دیواری سے باہر کی دنیا سے ہے۔

مدارس کے داخلی فرائض

ہم سب سے پہلے مدارس کے داخلی فرائض سے بحث کرتے ہیں اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے ان کو ترتیب سے ذکر کرتے ہیں:

ذہنی تشکیل

(ا) ذہنی تشکیل: اہل علم جانتے ہیں کہ ''اسلام'' ایک مخصوص ''عقلیت'' ہے جو خاص تعلیم و تربیت، خاص ماحول اور اہتمام سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مسلمان قومیت کا ہر فرد اسلامی ذہن بھی رکھتا ہو۔ جن لوگوں کی اسلام کی ذہنی تاریخ پر نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ بہت سے اسلامی عہدوں میں مسلمان جسم میں جاہلی دماغ ترکیب پا گیا ہے۔ اور اب تو یہ ذہنی امتزاج اور عقلی پیوند بندی بہت عام ہے۔ ہم کو یہ خطرہ ہے کہ زندگی کے متعلق غیر اسلامی تصورات، اور سیاسیات و معاشرت کے غیر اسلامی نظریات جن کے اثر سے اس وقت برّ و بحر، اور علم کلام کے الفاظ میں ''شواہق جبال'' کے رہنے والے محفوظ نہیں ہیں، حمل و نقل، نشر و اشاعت کے وسائل، پروپیگنڈے کے جدید طریقوں اور اختلاط و اجتماع کے امکانات کی کثرت کی وجہ سے مدارس کی محفوظ دنیا میں بھی پہنچ رہے ہیں، اور یہ دینی نظام اور مذہب کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

ذہنی تشکیل سے ہماری مراد اس کا وسیع مفہوم ہے۔اس سلسلہ میں عقائد بھی آتے ہیں اور طرز فکر اور نقطۂ نظر بھی۔

یہ ضروری ہے کہ اہل سنت کے متفق علیہ عقائد طالب علم کے دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اتار دیے جائیں کہ پھر ان کے نکلنے کا خطرہ نہ رہے، اس کا دماغ الحاد کے ادنیٰ شائبہ اور انحراف سے محفوظ کر دیا جائے، اس کو اسلامی عقائد پر راسخ اور غیر متزلزل یقین ہو۔ اس کی قوت واستحکام، مدارس کی کامیابی، مستقبل کی تعمیر، اور ''امت مسلمہ'' کی فلاح، عقائد کی ایسی ہی پختگی، یقین کے اسی استحکام پر موقوف ہے۔ زندگی اور اس سے بڑھ کر فتح وتسخیر کے لیے یقین محکم سے زیادہ کوئی چیز اہم اور شک وتذبذب سے زیادہ کوئی مرض مہلک اور خطرناک نہیں۔ یہی وہ ''ایمان'' ہے جو اسلامی جسم کا خون، زندگی اور روح ہے، اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر امت کے پورے قصر کی تعمیر ہے۔

آب حیات صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جام میں ہے

اسلامی حقائق میں سے ہم صرف چند حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

پہلی حقیقت یہ کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بتایا ہوا راستہ انسانیت کی منزل مقصود کا تنہا راستہ ہے۔ انسانوں کا قافلہ دشت میں بھٹکا ہوا ہے اور ناپیدا کنار سمندر میں راستہ بھولا ہے، اور روشنی کا مینار صرف اسلام ہے۔ انسانیت نزع کے عالم میں ہے، اور آب حیات صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جام میں ہے۔ اخلاق ومعاشرت، مذہب وسیاست کا جو نظام آپ نے پیش کیا، زندگی کا وہی تنہا نظام ہے۔ اس نظام کا ہر مقابل نظام ضلالت وگمراہی اور حماقت وسفاہت ہے۔

اسلامی نظام پر ایمان لانے کا تقاضا

غیر اسلامی نظام زندگی کی غلطی اور خرابی کا یقین بھی اسی قوت کا ہونا چاہیے جس قوت کا یقین اسلامی نظام کی درستی اور برتری کا ہے۔ لا إلـــــہ کی نفی میں بھی وہی شدت وقوت ہونی چاہیے جو إلا اللہ کے اثبات میں ضروری ہے۔

اسلامی نظام پر ایمان لانے اور اس کے الہامی ماننے کا تقاضا ہی یہی ہے کہ ہر متوازی نظام کا انکار کیا جائے: ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾[سورة يونس:۳۲]۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے ایمان کے اعلان کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا تھا: ﴿كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ﴾ [سورة الممتحنة:٤] ''(اے منکرین حق) ہم تمہارے منکر ہیں اور ہمارے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا ہو گیا ہے۔''

﴿كَفَرْنَا بِكُمْ﴾ کے اس جملہ میں بت شکنی کی وہی روح کام کر رہی ہے، اور توحید خالص کی وہی سطوت و جلال، اور وہی جذب و استغراق ہے جو آپ پر اس وقت طاری ہوگا جب آپ اپنے گرز سے آزر کے بت خانہ میں بتوں کو توڑ رہے تھے، بلکہ یہ زبانی جملہ اس ضرب۔ سے بڑھا ہوا ہے۔ اُس ضرب میں آپ نے قوم کے باطل معبودوں کو توڑا تھا، لیکن اِس ایک ضرب میں آپ نے اُن کے تمام باطل دیوتاؤں اور ذہنی وروحانی بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اہل ذوق اس جملہ کی گہرائی اور وسعت تک پہنچ سکتے ہیں۔ آپؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے تمہارے عقائد، اور تمہارے بتوں کا انکار کیا، بلکہ فرمایا کہ ہم سراسر تمہارے منکر ہیں۔ اس میں ان کا پورا نظام زندگی اور پورا فلسفۂ زندگی آ گیا۔

عوام کے مقابلہ میں علماء کا امتیاز

عوام کے مقابلہ میں علماء کو یہ امتیاز ہونا چاہیے کہ وہ اسلامی نظام سے دوسرے نظاموں کا تقابل کر کے اسلامی نظام کی برتری کو علمی حیثیت سے بھی سمجھتے ہوں، اور اس علم و تحقیق سے ان کے ایمان، اسلامی نظام کی محبت و ترجیح اور غیر اسلامی نظاموں کی نفرت میں اور اضافہ ہونا چاہیے۔

اس علم و نظر سے بڑھ کر ان کو دنیا میں اس نظام کو قائم کرنے کا جذبہ اور ولولہ ہو، اور وہ اس کے پُر جوش داعی اور مبلغ ہوں، اور ان میں اس کے لیے قربانی اور ایثار کا جذبہ ہو۔ بات بڑی ہے، لیکن حق ہے کہ ان کو اس کا ایسا جذبہ اور اس کی ایسی سچی لگن ہو جیسے اس شخص کو ہوتی ہے جو یہ دیکھ رہا ہو کہ گھر میں آگ لگی ہوئی ہے، سب بے خبر ہیں اور پانی صرف اسی کے

پاس ہے، اور صرف اسی صورت میں کسی انقلاب و اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ کم سے کم ان کو اس نظام کی تبلیغ و قیام کا اتنا جوش اور اس کے لیے قربانی کا اتنا جذبہ تو ضرور ہونا چاہیے جتنا باطل نظاموں کے حامیوں اور مبلغوں کو ہے۔

اسلام کے نظام کے محافظ صرف علماء اور اہل دین ہیں

اس سلسلے میں یہ بات بار بار کہنے کی ہے کہ اسلام کے نظام کے محافظ اور صحیح ہمدرد صرف علماء اور اہل دین کی جماعت ہے، اور اسلامی تاریخ میں اس کا تجربہ بار بار ہوا۔ بادشاہوں، شاہی خاندانوں، اور حکومت کے دعویداروں کی جنگوں اور آویزشوں میں لوگ بھول جاتے ہیں کہ ان جنگوں کی تہہ میں بعض اوقات اصول اور زندگی کے فلسفوں کی باہم آویزش اور کشمکش کام کر رہی تھی۔

ایک فلسفہ یہ تھا کہ مذہب کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہو، زندگی اور معاشرت مذہب کے تابع ہو، مذہبی قوانین و احکام اور خدا کے حدود و تعزیرات نافذ ہوں، مادیت و بہیمیت مغلوب ہو، عیش و عشرت اور اسراف کم ہو، اخلاقی اصلاح ہو، شخصی آزادی کے حدود مقرر ہوں، مذہب میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ ہو، اس فلسفہ کے داعی اور حامی امت کا دیندار طبقہ اور علمائے دین تھے۔

دوسرا فلسفۂ زندگی یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ آزاد ہو، زندگی اور معاشرت مذہب و اخلاق کے پابند نہ ہوں، کسریٰ و قیصر کے طرز کی سلطنت ہو، دنیا میں زیادہ سے زیادہ تمتع اور لطف اندوزی کا موقع ملے، بادشاہ کی آزادی غیر محدود اور رعیت صرف اخلاقی طور پر آزاد (یعنی محرمات و منکرات کے ارتکاب میں اس سے کوئی تعرض نہ ہو اور کسی قسم کی اخلاقی پابندی نہ ہو) اور ہر طرح سے غلام ہو، معاشرت و اجتماع کی ہر قسم کی غیر اسلامی تشکیل اور مذہب میں ہر زمانے کے مطابق ترمیم اور غیر مقید تجدد ہو سکتا ہے، اس فلسفہ کے حامی دنیادار امراء و سلاطین اور مسلمانوں کا غیر تربیت یافتہ طبقہ تھا۔ یہ دونوں فلسفے خلافت راشدہ کے بعد سے اس وقت تک موجود ہیں، اور آخر الذکر فلسفہ اور نظام حیات کے حامیوں کی ہر زمانہ میں اکثریت رہی ہے۔

مسلمانوں کی صحیح قیادت ورہنمائی اور علماء کی ذمہ داریاں

اس حقیقت پر بھی علماء کی نظر ہر وقت رہنی چاہیے کہ مسلمانوں کی کامل اور صحیح قیادت کے اہل صرف وہ ہو سکتے ہیں، اور مسلمانوں کی متوازن اور متناسب ترقی صرف انھیں کی رہنمائی میں ہو سکتی ہے۔ خلفائے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا دورِ حکومت اس بات کا بہترین شاہد ہے۔ دین وسیاست کی فصل وتفریق اور اہل دین واہل سیاست کی تقسیم کا جاہلی نظریہ اور علماء کی قطعی سیاسی ودنیاوی نا اہلیت کا خیال، مسیحی ذہنی ورثہ کے علاوہ مخالف دین جماعتوں اور اشخاص کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے۔

علماء کو اپنے فہم وتدبر، اپنے ایثار وقربانی، اپنی قوت عمل، اپنے اخلاص وللٰہیت اور اپنی سیرت کی پختگی اور استقامت سے غیر دینی عناصر کو پیچھے ہٹا کر مسلمانوں کی زندگی پر غلبہ اور نفوذ حاصل کر لینا چاہیے، قوت عمل اور ایثار میں مسلمانوں کی دوسری جماعت ان کی حریف نہیں ہو سکتی، اس لیے ان کو جماعتی اقتدار اور عصبیت جاہلیت کی بنا پر نہیں، بلکہ اسلامی نظام کی اور اسلام کے قدیم اور مستند معیار زندگی کو قائم کرنے کے لیے، اور اس کے شباب رفتہ کو واپس لانے کے لیے اپنی قربانیاں پیش کرنی چاہئیں، اور اس مقصد سے میدان میں آنا چاہیے۔

اس کام کے لیے جس علمی وذہنی تیاری اور تربیت کی ضرورت ہے، مدارس کو اس سے ہرگز غفلت نہیں کرنی چاہیے، اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ زندگی کے کسی اہم اور مؤثر شعبہ میں غیر دیندار اور غیر علماء کی رہنمائی کی ضرورت نہ پیش آئے، اور حتی الامکان علماء نظر انداز اور فراموش نہ ہونے پائیں، اور ان کی رہنمائی اور امداد سے استغناء نہ ہونے پائے۔ غیر دیندار جماعتوں اور ملحدوں نے انہیں نازک راستوں سے امت کے دماغوں پر استیلاء اور ان کی روزمرہ زندگی پر نفوذ حاصل کیا، اسی بنا پر امام غزالی نے اپنے زمانے کے علماء اور طلبہ کو جو غیر ضروری علوم میں مشغول تھے، یہ کہہ کر فن طب کی طرف متوجہ کیا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے اسلامی شہروں میں غیر مسلم یہودی اور اور نصرانی طبیب ہیں، اور مسلمان ان کے محتاج اور ان سے متاثر ہوتے ہیں۔[1]

---

(۱) احیاء العلوم

اس سلسلہ میں جن جدید علوم والسنہ کی ضرورت ہو، علماء کو بلا تامل ان کی طرف توجہ کرنی چاہیے، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سب تمام تر دین کی خدمت وحفاظت اور مذہب کے فروغ کے لیے ہو، اس وقت یہ جہاد ہوگا، اور یہ تیاری ﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ﴾ [سورة الأنفال: ٦٠] میں داخل ہوگی۔ ان عقائد وحقائق کے علاوہ طریق فکر، طریق بحث، مباحث ومسائل میں نقطۂ نگاہ، زندگی کا مقصد ومعیار اور روح خالص اسلامی ہونی چاہیے، اُن کے نزدیک آخرت دنیا پر مقدّم ہو، مادیت کا غلبہ ان پر نہ ہونے پائے، ہر چیز میں نیت خدا کی رضا اور اس کے نام کی بلندی ہو، یہ متاع کارواں ہے اور اس کی گم شدگی سے جماعتِ علماء کا امتیاز جاتا رہے گا۔

سیرت کی تعمیر

(۲) سیرت کی تعمیر: زندگی کی کشمکش میں ایمان ویقین کے بعد سب سے ضروری چیز، پختہ سیرت اور بلند اخلاق ہیں۔ قومیں اور جماعتیں انھیں دونوں بنیادوں پر دوسری قوموں اور جماعتوں پر فتح پاتی ہیں۔ خود مسلمانوں نے قرن اوّل میں اپنی معاصر وحریف قوموں پر جو تعداد میں، اسلحہ میں، مادی ساز وسامان میں اُن سے کہیں بڑھی ہوئی تھیں، ایمان واخلاق ہی کی خصوصیتوں کی بنا پر فتح پائی۔ آج بھی اشخاص اور جماعتوں کی پرداز کے لیے یہی دو بازو ہیں۔ بڑے سے بڑا علم حسنِ سیرت کے بغیر ناکافی بلکہ اپنے اور دوسروں کے لیے فتنہ اور مضر ہے۔ اہل علم ونظر کے سامنے خصوصاً ایسے زمانے میں جس میں علم بڑھتا جارہا ہے، اور سیرت واخلاق میں روز افزوں انحطاط ہے، اور جبکہ غیر مذہبی درسگاہوں کے طلبہ وفضلاء کے اخلاق اپنی درسگاہوں کے لیے، اداروں کے لیے، سوسائٹی اور خاندانوں کے لیے وبالِ جان بنتے جارہے ہیں، اس حقیقت کی زیادہ توضیح وتشریح کی ضرورت نہیں۔ طلبہ کو مستقبل قریب میں زندگی کے جس معرکہ اور جماعتوں اور اصولوں کی جس رزم آرائی میں شرکت کرنی ہے، اس میں اپنے اصولوں کی دعوت وتبلیغ کے لیے، اپنے مذہب وجماعت کے وقار کے لیے جس قدر بے داغ سیرت، اعلیٰ کیرکٹر، بلند ہمت استغناء، خودداری اور نزاہت کی ضرورت ہے،

کسی چیز کی نہیں۔ ان ہتھیاروں سے وہ زندگی کا بڑے سے بڑا معرکہ فتح کر سکتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اس میں ہمارے مدارس کے فضلاء غیر مذہبی لوگوں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا مشاہدہ اور بار بار کا تجربہ ہے کہ گہری مذہبیت اور اچھی صحبت و تربیت کے بغیر اعلیٰ اور مستحکم سیرت نہیں پیدا ہوتی، اور اس کا سامان اس عام مذہبی و اخلاقی تنزل کے زمانے میں بھی جتنا عربی مدارس میں ہے، دوسری جگہ ناپید ہے۔

اس کے ساتھ اس حقیقت کے بھی اظہار کی ضرورت ہے کہ علماء کی دینی سطح عوام کی سطح سے بلند ہونی چاہیے، تب ہی وہ مؤثر ہو سکتے ہیں۔ عوام میں دینداری پیدا کرنے کے لیے، ان میں مذہب کا رنگ، اس کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے، اور ان کے عقائد و اعمال و رسوم کی اصلاح کے لیے گہرے اور شوخ مذہبی رنگ، جذب وشوق اور تجدیدی و اصلاحی رنگ کی ضرورت ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر علماء کا خاص فریضہ اور ان کا مقصد آفرینش ہے، اس میں ان کو تساہل سے کام نہیں لینا چاہیے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ [سورة آل عمران: ۱۱۰] اور ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [سورة آل عمران: ۱۰٤] کے مصداق اگر علماء نہ ہوں تو کون ہو سکتا ہے؟ اس بارے میں ان کو حضرت مجدد سرہندیؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا نمونہ سامنے رکھنا چاہیے، جن کی توجہ اور ہمت سے ہندوستان میں عظیم الشان دینی انقلاب رونما ہوا، جو دوسرے ممالک کے لیے قابل رشک ہے۔

مقصد کا تعین اور نصب العین کی بلندی

(۳) ذہنی تشکیل اور سیرت ہی کے سلسلہ میں ایک نہایت اہم اور مؤثر چیز مقصد کا تعین اور وضاحت، اور نصب العین کی بلندی ہے۔ متعین اور واضح مقصد اور بلند نصب العین ہی وہ چیز ہے جو چستی اور نشاط اور زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی لیے جا بجا مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کے ظہور کے بلند ترین مقاصد اور اعلیٰ نصب العین کو بار بار یاد

دلایا ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ [سورة آل عمران: ۱۱۰]، ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [سورة البقرة: ۱٤۳]، اور اسی لیے ان کے درخشاں مستقبل اور ان کی آئندہ کامرانیوں کا ذکر کیا ہے، تا کہ ان کی افسردگی، مردہ دلی اور ناامیدی دور ہو، کہ یہ جماعت کی زندگی کے لیے سم قاتل ہے: ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ [سورة آل عمران: ۱۳۹]، ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ﴾ [سورة النور: ۵۵]، سورۂ یوسف، سورۂ قصص اور سورۂ روم و سورۂ فتح کو غور سے پڑھیے، اور جن صبر آزما، یاس انگیز اور بظاہر تاریک حالات میں یہ سورتیں نازل ہوئیں، ان کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سورتوں میں بھی مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارات ہیں، تفصیل و تشریح کا یہ موقع نہیں۔

علامہ اقبال مرحوم نے ''اسرار خودی'' میں مقصد کی تابندگی اور بلندی اور اس کے نفسیاتی اور اجتماعی اثرات سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ قوموں کی زندگی کے عمیق مطالعہ پر مبنی ہے۔

مدارس عربیہ کے طلبہ میں افسردگی اور بے کیفی کا اصل سبب

عربی مدارس کے طلبہ کے متعلق عام شکایت ہے کہ ان میں غیر معمولی افسردگی اور زندگی کی ایک خاص بے کیفی نظر آتی ہے، اس کا جواب مختلف طریقوں پر دیا جاتا ہے، کبھی خاص ماحول، طریق رہائش اور نصاب و طرز تعلیم کی خشکی کا عذر کیا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض معترضین اس جواب سے مطمئن ہو جاتے ہوں، اور ممکن ہے کہ اس افسردگی میں ان چیزوں کو بھی دخل ہو، لیکن ہمارے نزدیک اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان طلبہ کے سامنے کوئی متعین اور واضح پروگرام، کوئی صاف اور روشن راستہ، کوئی پُر امید اور حوصلہ افزا مستقبل اور کوئی بلند نصب العین نہیں، وہ نظر اٹھاتے ہیں تو ان کو سامنے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے، نصب العین میں سخت ابہام اور شک اور ارادوں میں شدید تذبذب

اور ذہن میں سخت الجھاؤ ہوتا ہے، متعین لیکن پست نصب العین بھی کوئی امنگ، بلند نظری اور نشاط روح کا سامان نہیں پیدا کرسکتا۔

عربی مدرسہ کا وہ ذہین اور با استعداد طالب علم جو اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ فراغت کے بعد کچھ طب پڑھ کر کسی قصبہ یا شہر میں قسمت آزمائی کرے گا، یا کسی سرکاری اسکول میں مدرس عربی یا فارسی (مولوی) کی جگہ حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرے گا اور اس کا یہ علمی ذوق، مطالعہ، علوم و معارف سب اسی مدرسہ کے حدود تک ہیں، اس کے بعد معاش کی کشمکش ہے، زندگی کی خشک اور بے کیف سنجیدگیاں ہیں، غیر علمی اور غیر دینی ماحول ہے، اس سے سرگرمی اور زندہ دلی اور خود اعتمادی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟ اپنی حقارت کا اندرونی احساس، اپنے خاندان یا ہم عمر انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں سے (جن کا مستقبل بھی کچھ زیادہ روشن نہیں) تقابل اور ذہنی و اخلاقی مرعوبیت جو سراسر ناواقفیت کی بنا پر ہے، اس میں مزید افسردگی اور بے اعتمادی پیدا کرتی رہتی ہے۔

اس صورت حال کا واحد علاج

اس کا ایک ہی علاج ہے، اور وہ یہ کہ اُن کو اُن کی قیمت بتائی جائے، اُن کو بتایا جائے کہ وہ کس اہم اور مقدس کام کے لیے تیار ہورہے ہیں، ان کی زندگی کا نصب العین کس قدر بلند اور ان کا مطمح نظر کتنا اعلیٰ ہے، دنیا کی تاریخ میں (صحابہ کرامؓ اور مصلحین امت کے علاوہ) کسی جماعت کا جو بلند سے بلند نصب العین رہا ہے، اُن کا نصب العین اس سے کہیں بلند ہے، اور آج بھی دنیا کے مختلف ممالک میں جتنی جماعتیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا اصلاحی و معاشرتی کام کررہی ہیں اور بلند مقاصد رکھتی ہیں، ان کے مقاصد بھی ان کے مقاصد کے مقابلہ میں کہیں فروتر اور پست ہیں۔

کیا بندوں کے نام خدا کا پیغام پہنچانا، پیغمبر خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی تبلیغ، کیا تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس کی خدمت ان بیشمار انجمنوں کے مقاصد سے فروتر ہے جو حشرات الارض کی طرح زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں، اور جن کے کارکنوں میں زیادہ جوش

اور زندگی ہے؟ کیا اخلاق واجتماع وسیاست کے آسمانی نظام کے قیام وتاسیس کا پیغمبرانہ فریضہ اور انسانی زندگی کی وحی الٰہی کے مطابق تشکیل، کسی اشتراکی، قومی وسیاسی تحریک سے کم درجہ کا کام ہے؟ اور کیا اسلام اور مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ کی عظیم الشان اور مجددانہ تحریک کسی تحریک اصلاح مذہب اور ''رفارم'' سے پست تر ہے؟ پس اگر درحقیقت طلبہ کے یہی مقاصد ہیں (اور حقیقتاً ان کے یہی مقاصد ہونے چاہئیں) اور وہ انھیں کاموں کے لیے تیار ہو رہے ہیں، تو اُن کو اپنی قسمت پر ناز ہونا چاہیے، اُن کا سر اونچا اور اُن کا دل ولولوں سے معمور، اُن کو جوش ومستی سے مخمور، اور افسردگی اور مردہ دلی کو اُن سے دور ہونا چاہیے، ان کو اپنے علوم کی شرافت اور ان معارف کی عظمت پر غور کرنا چاہیے جن کی دولت سے اللہ نے ان کو مالا مال کیا ہے، وہ اگرچہ دنیا کی دولت سے تہی دامن ہیں، لیکن علم کی دولت سے تہی سینہ نہیں ؂

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج ۔۔۔ درسینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

اور اگر ان کے یہ مقاصد اور ان کے سامنے کام کا یہ نقشہ نہیں تو ہم کو ان کے حال پر رحم آتا ہے، اور ان کی زندگی کی بربادی اور ناکامی پر تعزیت کا موقع ہے کہ ان سے بڑھ کر ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ [سورة الحج:۱۱] کا مصداق کوئی نہیں، وہ اپنی تعلیم کے جس مرحلہ پر بھی ہیں ان کو اپنی جگہ بدل دینی چاہیے، عربی مدارس کے بجائے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا رخ کرنا چاہیے کہ ان کے لیے زندگی کے اس پست نصب العین کے ساتھ عربی مدارس میں نامرادی وناکامی، حسرت ویاس اور نوحہ وماتم کے سوا کچھ نہیں۔ ہم صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ عربی مدارس کا ہرگز یہ کام نہیں کہ وہ کسی خاص زبان یا علوم کی تعلیم دیں، یا زمانہ کی چلتی ہوئی مشنری میں فٹ ہونے کے لیے پرزے ڈھالیں، یہ کام جن فیکٹریوں میں ہوتا ہے اُن کو وہاں کا رخ کرنا چاہیے۔

طلبہ کی ذمہ داریاں

عربی مدارس کے طلبہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے سامنے بہت بڑا کام ہے، دین اس وقت سخت کس مپرسی اور غربت کی حالت میں ہے، ملک کی تمام غیر مذہبی تربیت یافتہ

جماعتوں نے مذہب کی تحریف پر کمر باندھ لی ہے، علماء اور ان جماعتوں کے خلاف جو مذہب کے اصلی نظام کے محافظ ہیں، ہر جگہ بغض و عداوت کی آگ روشن ہے، اور اس بارے میں عوام اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں عجیب نادر الوقوع اتحاد ہو گیا ہے: ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ﴾ [سورة آل عمران:۱۱۸]، ان کو ان اشخاص اور جماعتوں کی مرضی کے خلاف زندہ رہنا ہے، اور شریعت کو زندہ رکھنا ہے، انسانوں کی خواہشات اور زمانہ کے رجحانات کے برخلاف اور خود اہل مذہب کی سرد مہری بلکہ مخالفت کے باوجود کسی ''خشک'' اخلاقی و روحانی اور تعمیری نظام کو قائم کرنا، یا اس کی حفاظت کرنا آسان کام نہیں، اس میں افسردگی اور پژمردگی کا کیا گزر؟ اس کے لیے فرہاد کا جگر اور قیس کا جنون چاہیے۔

لیکن ان ہمت شکن حالات سے ان کو قطعاً مایوس نہیں ہونا چاہیے، ظہور اسلام کی محیر العقول تاریخ کے علاوہ جس کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے، بیسویں صدی کی اس پہلی تہائی کی تاریخ ان کی ہمت افزائی کے لیے کافی ہے، اس عرصہ میں دنیا میں متعدد غیر معقول اور بظاہر ناممکن العمل تحریکیں شروع ہوئیں، لیکن اپنے کارکنوں کی مسلسل کوششوں اور قربانیوں سے وہ حیرت انگیز طریقہ پر کامیاب ہوئیں اور انھوں نے بڑے بڑے وسیع نظام اور عظیم سلطنتیں قائم کر لیں، کیا اسلام کی تحریک کسی ایسی وطنی، سیاسی یا اقتصادی تحریک سے زیادہ ناممکن العمل ہے؟ ہم اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں!

نصاب تعلیم کا مسئلہ

(۴) مدارس کے اندرونی فرائض کی فہرست میں نصاب تعلیم اور اس میں اصلاح و تغیر کا مسئلہ کافی اہمیت رکھتا ہے، لیکن اس موضوع پر (خصوصاً ندوۃ العلماء کی تحریک کے آغاز کے بعد سے) بہت، کافی اظہار خیال کیا جا چکا ہے، اور اس پر اچھا خاصا لٹریچر تیار ہو گیا ہے۔ اب شاید مشکل سے کوئی شخص یا ادارہ عربی مدارس کے قدیم اور مروجہ نصاب درس سے متعلق یہ تصور رکھتا ہو گا کہ یہ وہ آخری آسمانی صحیفہ ہے جو ناقابل نسخ ہے، اس میں ادنیٰ ترمیم الحاد کے

مرادف ہے۔ اصولی اور نظری حیثیت سے اس میں تغیر کے مذہبی جواز اور ترمیم واضافہ کی علمی ضرورت کو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے، لیکن اس کی طرف ابھی تک عام قدم نہیں اٹھایا گیا۔
یہ ترمیم اور تبدیلی غیر دانشمندانہ عجلت کے ساتھ اور وقتی تأثرات کے ماتحت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ مسلمانوں کی مذہبی ضروریات، علماء کے جماعتی فرائض، اسلام کی مخصوص تعلیم و ثقافت اور زمانۂ ماضی کے ضروری علمی ذخیرہ کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہیے۔

مدارس عربیہ کے نصاب کا صحیح مفہوم

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس نصاب کا صحیح مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے جس کی تعلیم کے لیے عربی مدارس قائم کیے جاتے ہیں۔ اس کی صحیح تعریف ہمارے نزدیک یہ ہے کہ "یہ وہ علمی اور کتابی وسیلہ ہے جو اسلام سے گہری اور براہ راست واقفیت اور اسلام کے مستند علمی اور تاریخی ماضی (۱) سے ربط پیدا کرتا ہے، اور ایسے اشخاص کے پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے جو مسلمانوں کی مکمل رہنمائی کے اہل ہو سکتے ہیں۔"

ہمارے نزدیک یہ تعریف بالکل کافی ہے، لیکن اس پر ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اس تعریف کے ماتحت بعض ایسے علوم غیر ضروری قرار پائیں گے جن کا حاصل کرنا نفس اسلام سے گہری اور براہ راست واقفیت کے لئے ضروری نہیں، اور نہ وہ خالص اسلامی ماحول کی پیداوار ہیں، لیکن سلف کی علمی کوششوں سے واقفیت اور مسلمانوں کے علمی ذخیرہ کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔ اس عظیم الشان ذخیرہ کی حفاظت جو ہزار بارہ سو برس میں فراہم ہوا، کسی نہ کسی درجہ میں ہر صدی اور ہر زمانہ کے علماء کا فرض ہے۔ ہم کو اس کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں، لیکن یہ بہر حال اسی طرح کا ایک اخلاقی اور تاریخی فریضہ ہے جس طرح مسلمان بادشاہوں کی بنائی ہوئی تاریخی عمارتوں اور اسلامی آثار قدیمہ کی حفاظت کسی نہ کسی درجہ میں

(۱) مسلمان قوم کا علمی اور تاریخی ماضی جو درحقیقت اسلام کا مستند علمی اور تاریخی ماضی نہیں ہے، اس تعریف سے خارج ہے، اور اس سے ربط پیدا کرنا اس نصاب تعلیم کے مقاصد میں داخل نہیں، مثلاً مسلمانوں کے مذہبی اور علمی انحطاط یا غیر اسلامی علمی وسیاسی عروج کا عہد جیسے عہد اموی، عہد عباسی، الخ۔

ضروری اور اخلاف کا اخلاقی فرض ہے، اور کوئی مضائقہ نہیں کہ اس کے لیے کوئی ایسی جماعت رہے جس کے پاس اس کے لیے وقت ہو، لیکن یہ وہ محور نہیں ہے جس پر مسلمانوں کا سارا نظام تعلیم گردش کرے۔ اسلام کی طرف کسی چیز کی نسبت کرنے میں اور مسلمانوں کے لیے کسی چیز کو لازمی قرار دینے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہم کو اس زمانہ کے عام لوگوں کی طرح ''اسلامی علوم'' اور ''مسلمانوں کے علوم'' میں، نیز اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن میں خلط مبحث نہیں کرنا چاہیے۔

عربی مدارس -- جن کے لیے ہم مسلمانوں سے اسلام کے نام پر امداد کے طالب ہیں، اور جن کی بقا و ترقی مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے -- ایسے علوم اور تصنیفات کی حفاظت کے لیے وقف نہیں ہو سکتے جو وقتی ضروریات کے ماتحت یونان یا ایران سے منتقل ہو کر مسلمانوں میں آئے اور جن کا دور ختم ہو گیا۔ اسلامی نصاب تعلیم مسلمانوں کی تاریخ نہیں ہے جس کا موضوع ناموران اسلام کے کارناموں کی اشاعت اور حفاظت ہے، اور نہ عربی مدارس آثار قدیمہ کے محکمے ہیں جن میں پرانے سکے، قدیم کتبے، پارینہ اوراق اور تاریخی دستاویزیں محض لوجہ التاریخ رکھی رہیں۔ اسلامی تعلیم کے مرکز اسلامی زندگی کے مرکز ہیں، جن کو ایسی چیزیں گھیرے نہیں رہ سکتیں جن کا وقت ختم ہو گیا۔

اس تعریف کے ماتحت سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت ان مضامین کو حاصل ہونی چاہیے جو اسلام کی براہ راست تعلیم میں داخل ہیں، یا اس تعلیم کے لیے بلا واسطہ معاون اور موقوف علیہ ہیں۔ اسلام کی اصل تعلیم وہ زندہ اور پائندہ تعلیم ہے جو کبھی پرانی نہیں ہو سکتی، جس میں قدامت اور بوسیدگی کو ذرا دخل نہیں۔ اسلام کی طرح اس کی تعلیم بھی جاوداں ہے۔

جو جماعت اس دائمی ابدی نظام کے ساتھ اپنے کو منسلک اور وابستہ کر دے گی اور اپنا دامن اس کے دامن سے باندھ دے گی، وہ اس کی طرح زندۂ جاوید بن جائے گی، دنیا کا کوئی انقلاب اس کو مٹا نہیں سکتا، زمانہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا، اس کے کمال کو زوال نہیں، اس کی بہار کو خزاں نہیں۔

لیکن جس جماعت کی زندگی کا انحصار انسانی علوم اور تحقیقات پر ہوگا، خواہ وہ قدیم یونانی

علوم ہوں یا جدید مغربی، وہ زمانہ کا ساتھ زیادہ دنوں تک نہیں دے سکے گی، وہ بار بار پیچھے رہے گی اوران علوم وتحقیقات کی طرح کبھی نہ کبھی فرسودہ اور بیکار ہوکر رہے گی۔

جن علوم یا جماعتوں کا طبعی وقت ختم ہو جاتا ہے، ان کو زندگی کی کوئی جدوجہد زندہ نہیں سکتی۔ انسان کے پیدا کیے ہوئے علوم، کمالات وخیالات ایک خاص عمر رکھتے ہیں، جب وہ عمر ختم ہو جاتی ہے اوران کا طلسم ٹوٹتا ہے، تو ان کے ساتھ وہ جماعتیں بھی رخصت ہو جاتی ہیں جو اُن سے مربوط تھیں، اوراس وقت ان کو اپنی بقا کے لیے کوئی پروپیگنڈا یا جدوجہد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رکھ سکتی: ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ أَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ﴾[سورة الرعد:۱۷]۔

اس لیے علمائے مدارس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ قرآن وحدیث سے براہ راست منسلک رہیں، اوران کی خدمت اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔

طریقۂ تعلیم میں اصلاح، زمانہ کے حالات کے مطابق نصاب کی تیاری، کتابوں کی تالیف اور انتخاب، بعض جدید ضروری مضامین کا اضافہ، عربی زبان کی ایک زندہ زبان کی طرح تعلیم ایسے اہم تعلیمی مسائل ہیں جو علماء اور اصحاب مدارس کی فوری توجہ کے محتاج ہیں۔ ہم یہاں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے، تفصیلات کی کوئی حد نہیں، اوران میں اختلاف کی بہت گنجائش ہے۔

کاش کہ علماء اور منتظمین مدارس اجتماعی طور پر ان مسائل کو حل کرتے اور ہندوستان کے عربی مدارس میں جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں، ایک مشترکہ تعلیمی نظام جاری ہوسکتا۔ یہ حضرات علماء کے بہت سے مشاغل سے زیادہ ضروری فریضہ ہے اوراس کے نتائج مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں بہت مؤثر اوردوررس ہیں۔

عام مطالعہ اور کتابوں کا ذوق

مدارس عربیہ کے معلمین ومنتظمین کے فرائض نصاب کی تدریس تک محدود نہیں، اور علم کسی خاص نصاب میں منحصر نہیں۔ یہ نصاب خاص قسم کی علمی استعداد اور ذوق پیدا کرنے

کے لیے ہے۔ اس ذوق کا نہ پیدا ہونا نصاب اور اس کے معلمین کی بڑی ناکامی ہے۔

عرصہ سے ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں افسوسناک علمی انحطاط نظر آرہا ہے۔ علمی ذوق، وسعت نظر، جدت فکر اور علمی اجتہاد معدوم ہوتا چلا جارہا ہے۔ مدارس اور تعلیمی حلقوں پر ایک خاص قسم کا علمی جمود جس کو ہم نصابیت یا مدرسیت سے تعبیر کر سکتے ہیں، طاری ہوتا جارہا ہے۔ صحیح علم کی حلاوت اور چاشنی نہیں پیدا ہونے پاتی۔ اسلام کی اصلی روح، علم کے اصل جوہر، بلند تصورات اور حقائق سے طلبہ اور فضلاء کے ذہن ناآشنا رہتے ہیں، سلامت فکر اور دقت نظر دونوں نایاب ہیں۔ اس میں نصاب کی خاص ساخت، مخصوص طریقۂ تعلیم اور طلبہ کی پست ہمتی کو یکساں دخل ہے۔

ضرورت ہے کہ خاص توجہ اور تربیت سے طلبہ میں علمی ذوق پیدا کیا جائے، نصاب کے سوا طلبہ کو اچھا اسلامی لٹریچر دکھایا جائے، اور ان ائمہ اور مفکرین اسلام کی تصانیف کا ذوق پیدا کیا جائے جن کی کتابوں میں اسلام کی صحیح روح ملتی ہے، علم و اجتہاد کے چشمے ابلتے ہیں، اور اسلام کی بنیادیں قلب و دماغ میں مستحکم ہوتی ہیں، مثلاً امام ابن جوزیؒ، امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ، حضرت مجدد سرہندیؒ، شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

کتابوں کا صحیح انتخاب اور ان کی صحیح ترتیب کے متعلق مشورہ مدرسین کے اہم فرائض میں سے ہے، اور ذہنی اور مذہبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ عربی مدارس اسلامی ثقافت کے اصلی مرکز ہیں۔ اسلام کے مستند ماضی کے اہم اشخاص سے واقف ہونا، ان کے مراتب کو پہچاننا، ان کی خدمتوں سے واقف ہونا اور اعلیٰ و مجتہدانہ اسلامی تصنیفات سے روشناس ہونا تعلیم کا اہم جزو ہے۔

معلمین

نصاب درس کسی جماعت کے پیدا کرنے کا تنہا ضامن نہیں، وہ ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جو کسی جماعت کے پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے اس کی تعریف میں علمی اور کتابی وسیلہ اور ''معاون'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ ایسی جماعت

کے پیدا ہونے کا بہت کچھ انحصار اس نصاب کے معلمین اور مدرسہ کے موافق ماحول پر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ معلمین کی خوبی نصاب کے نقائص کی بہت حد تک تلافی کر سکتی ہے، لیکن بہتر سے بہتر نصاب معلمین کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ کامیاب معلمین کے لیے شرط ہے کہ اگر تحقیق و اجتہاد کا درجہ نہیں تو کم سے کم اپنے زیر درس مضامین کا ذوق رکھتے ہوں، دینی اور اخلاقی حیثیت سے طلبہ اور عوام سے بلند ہوں، پختہ اصول اور مستحکم سیرت کے مالک ہوں، اور تبلیغی روح اور جوش رکھتے ہوں۔ اخلاقی حیثیت سے غیر ممتاز، اصول و سیرت کے لحاظ سے خام، پیشہ ور اور ملازمانہ ذہنیت رکھنے والے ہر ادارے کے لیے غیر موزوں، لیکن عربی مدارس کے لیے نہ صرف غیر مفید بلکہ مضر ہیں۔

جسمانی تربیت

عام تعلیم گاہوں کی طرح بلکہ شاید ان سے زائد عربی مدارس کو اپنے طلبہ کے لیے تعلیمی، ذہنی اخلاقی اور مذہبی تربیت کے علاوہ جسمانی تربیت کا بھی انتظام کرنا چاہیے، کہ کامیابی اور یکسانی کے ساتھ تعلیمی زمانہ ختم کرنے اور مستقبل میں زندگی کی کشمکش میں شریک ہونے اور اپنے دینی و اصلاحی فرائض انجام دینے کے لیے اچھی صحت، جسمانی تربیت اور قوت برداشت کی ضرورت ہوگی۔ مدارس کو پچھلی صدیوں کی خانقاہیں نہیں بننا چاہیے۔ یہ جیسے کہ ہم نے عرض کیا ہے، اسلام کے قلعے ہیں۔ قلعوں کے محافظوں اور سپاہیوں کو مسلح ہونے سے پہلے تندرست اور قوی ہونا چاہیے۔ اس بارے میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سنوسی علماء و مشائخ صحیح نمونہ ہیں۔

اس سلسلہ میں جبکہ ہم مدارس کے اندرونی فرائض کی فہرست ختم کر رہے ہیں، ایک بار پھر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ عربی مدارس کا فرض ہے کہ وہ ایسے وسیع النظر، صاحب بصیرت، عالی حوصلہ اور باہمت علماء پیدا کریں جو مسلمانوں کے دور انتشار میں (جیسے کہ اس وقت ہندوستان میں ہے) مسلمانوں کی صحیح اور بے غرض رہنمائی کر سکیں، اور ان کو ان کے اعلیٰ مقصد (حیات اسلامی) تک پہنچا سکیں، اور جب اور جہاں صحیح اسلامی حکومت قائم ہو، اس کے لیے

لائق وزیر، قاضی بلکہ خلیفہ مہیا کرسکیں، اور ملک میں خواہ کوئی نظام سیاسی اور کچھ حالات معاشی ہوں، اعلیٰ مقصد سے غافل ہوئے بغیر اسلام کی حفاظت کا فرض انجام دے سکیں۔

مدارس کے بیرونی فرائض مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ

مدارس کے اساتذہ، ارباب اختیار اور طلبہ کا اس وقت سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کی از سر نو زندگی کی کوشش کریں۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ یہ فرض کر کے کہ ہندوستان میں حقیقی مسلمانوں کا وجود نہیں، حقیقی اسلام کی تبلیغ کے لیے نکلیں، اور بالکل پہلے قدم سے خالص پیغمبرانہ اصول پر اور بالکل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریق اور عمل کے مطابق مسلمانوں کی اس ''جاہلیت'' میں اسلام کی توحید خالص اور توحید کامل کی تعلیم دیں، ناواقفوں کو کلمہ پڑھائیں، زندگی بخش اور انقلاب انگیز توحید سے ان کی روح اور ذہن کو آشنا کریں، اور اسی راہ سے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں، ان مسلمان ''نو مسلموں'' کو احکام اور فرائض اسلام کی تعلیم دیں، گاؤں گاؤں اور شہر شہر اسلام کے احکام کی اشاعت کریں اور فرائض اسلام کو اپنی تبلیغی جدوجہد سے از سر نو زندہ کریں، وہ وقت کے تمام سیاسی و معاشی اور مدنی مسائل سے کچھ مدت کے لیے آنکھ بند کرلیں اور صرف مسلمانوں کو مسلمان بنانے کا کام کریں۔

اسلامی تاریخ کے عمیق مطالعہ، دنیائے اسلام کی مختلف تحریکات کے وسیع علم اور ہندوستان کے طویل سیاسی تجربہ نے تمام اہل فہم حضرات کو اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ بنیادی اور حقیقی کام مسلمان بنانے ہی کا کام ہے، اس کے بغیر مسلمانوں کی تعمیر نو کی ہر کوشش اور ان کی تنظیم، ترقی اور اقتدار کی ہر تحریک مستقل آوارہ گردی اور ایک نئے فتنے کے مرادف ہے۔ یہ کام اگرچہ تمام مسلمانوں کے کرنے کا ہے، لیکن علماء اور طلبہ کا خصوصیت کے ساتھ یہ فریضہ ہے، اور وہ تھوڑی توجہ سے یہ کام دوسروں سے اچھا کر سکتے ہیں۔

سر دست ان مبلغین کو دیہاتوں اور ان بستیوں کا رخ کرنا چاہیے جہاں شہری فتنے ابھی

نہیں پہنچے، اور جہاں مسلمان ابھی ذہنی انتشار میں مبتلا نہیں ہوئے۔

یہ کام خالص پیغمبرانہ کام ہے، اس لیے اس میں پیغمبرانہ اصول کی پابندی لازمی ہے، ضروری ہے کہ اس للٰہی کام میں وہ عناصر شامل نہ ہونے پائیں جو ہماری قومی تحریکوں کے لوازم بن گئے ہیں، اور جو مدت سے مسلمان جماعتوں کے جسم وقلب کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں، یعنی نمود ونمائش، پروپیگنڈا، جاہ طلبی اور نفسانیت۔

حسب ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے:

(۱) مبلغین استغناء سے کام لیں، اپنا کھائیں اور اپنا خرچ کریں، تبلیغ ونصیحت، گفتگو اور معاملہ میں انتہائی تواضع اور فروتنی، لیکن روپیہ پیسہ اور کھانے پینے کے معاملہ میں انتہائی خودداری اور بے نیازی، ﴿قُلْ لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً﴾ [سورة الأنعام: ۹۰] ہر وقت پیش نظر ہے۔

(۲) اس کام میں خدا کی رضا جوئی اور اس کے کام کی بلندی کے سوا کوئی اچھی یا بری نیت شامل نہ ہونے پائے، یہاں تک کہ ان دینی درس گاہوں کی تبلیغ وتشہیر (پروپیگنڈا) یا جماعت علماء کے وجود وبقا کی کوشش (جو بجائے خود صحیح اسلامی مقاصد ہیں) اس مقصد کے ساتھ شریک نہ ہوں۔ قلب ودماغ کو اس مختصر سے وقت میں جتنا صاف اور رضائے الٰہی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے خیال کے سوا ہر مقصد سے خالی رکھا جا سکے، اس کام کے لیے مفید ہوگا۔

جماعتی عصبیت، قومی اقتدار کی نیت، کسی قسم کا سیاسی پروپیگنڈا، کسی انتخاب کے لیے لوگوں کو تیار، کسی قومی کام کے لیے زمین کو ہموار، اور کسی خاص جماعت یا سیاسی مسلک کے حق میں فضا کو سازگار بنانے کی کوشش اس تحریک کو بہت نقصان پہنچائے گی، اور بڑی مزاحمتوں اور بدگمانیوں کی دعوت دے گی۔ بعض عارفوں کا خیال ہے کہ اس موقع پر دوسروں کی ہدایت کی نیت بھی نہیں ہونی چاہیے، صرف احکام الٰہی کی تعمیل اور اس کے ذریعہ سے قرب خداوندی حاصل کرنے کی نیت ہونی چاہیے۔ اس میں بے شمار مصالح ہیں، کام کرنے کے بعد اس کی حکمت خود نظر آئے گی۔

(۳) ایمان کامل اور فرائض کے سوا ابتدا میں ہر قسم کی فروعی اور اختلافی باتوں سے گریز

کیا جائے، ﴿اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ [سورة النحل:١٢٥] پر پورا پورا عمل ہو، انتہائی شفقت و محبت کے ساتھ کام کیا جائے، دلوں کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی جائے، ہر قسم کی سخت کلامی اور درشتی کو ہنسی خوشی برداشت کیا جائے، ہر کلمہ گو اور نام کے مسلمان کا بھی احترام کیا جائے۔

(۴) اس راہ میں جسمانی مشقت برداشت کی جائے اور زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانی سے کام لیا جائے کہ ان چیزوں کی اللہ کے یہاں بڑی قیمت ہے، اور ان سے بڑے برکات حاصل ہوتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ إِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [سورة العنكبوت:٦٩].

(۵) ارواح وقلوب کا انقلاب اور اسلامی زندگی صناعی اور میکانکی طریقوں سے نہیں پیدا ہوسکتی۔ اس کے لیے روحانیت کی ضرورت ہے، لیکن اس روحانیت کے پیدا ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، یہ روحانیت اس راستہ پر چلنے اور تکلیف کو برداشت کرنے سے خود بخود پیدا ہوگی۔ قرآن مجید کی آیات اور صحابہؓ اور خواص امت کے واقعات اس کے شاہد ہیں، اور ہم حقیقتاً روحانیت کے کسی خاص درجہ اور اعلیٰ مقدار کے مکلّف نہیں، اس لیے اس کی خاطر کسی ایسے کام میں تاخیر کرنا جس کے ہم مکلّف ہیں، درست نہیں۔

یہ کام جس قدر ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے، یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہیں ہے، یہاں پتھر کی سلوں سے زندگی کے چشمے جاری کرنے ہیں اور پہاڑ کے جگر سے دودھ کی نہر بہانی ہے، یہاں ہفتوں اور مہینوں کا سوال نہیں، یہ عمروں اور اشخاص کی پوری پوری زندگیوں کا کام ہے۔

لیکن جس قدر یہ مشکل کام ہے اسی قدر اس کی کامیابی بھی یقینی ہے، اور اسی قدر یہ کامیابی عظیم الشان اور بے نظیر ہے، خود قرآن مجید اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت اس کی بہترین گواہ ہیں۔

اگر عربی مدارس کے معلمین وطلبہ اس کام کے لیے پابندی کے ساتھ ہفتہ میں ایک دن

بھی دیں تو کچھ مدت کے بعد ان کو انشاء اللہ اپنی کوشش اور محنت کے نتائج نظر آئیں گے، اوران مدارس کے جوار میں جہاں اکثر ان مدارس کا کوئی دینی اور اخلاقی اثر نہیں ہوتا، اوران تبلیغی حلقوں میں جو مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے بہت پسماندہ ہیں، خاص قسم کی مذہبی زندگی کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔

لیکن اگر کامیابی کے آثار نظر نہ آئیں تو کام کرنے والوں کو بد دل نہیں ہونا چاہیے، کبھی نہ کبھی اس کا اثر ہوگا: ﴿وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ﴾[سورة النجم: ٤٠]، ﴿لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم﴾ [سورة آل عمران: ١٩٥]، ﴿لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ [سورة هود: ١١٥] ۔اسی لیے بہتر ہے کہ لوگوں کی ہدایت پر ساری توجہ مبذول نہ کی جائے اوراس کو اپنی محنت کا صلہ نہ سمجھا جائے، ورنہ لوگوں کی بے توجہی اور بے اثری سے دل شکنی اور ناامیدی ہوگی، تعمیل حکم مقصد ہونا چاہیے اور وہ بہرحال حاصل ہے۔

اس کام میں ایک دوسرا فائدہ بھی یقینی ہے، اور وہ عام ہدایت سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں، وہ یہ کہ خلوص اور استقامت کے ساتھ کام کرنے والوں میں اسلام کے وفادار سپاہی، ثابت قدم مجاہد اور ایسے اہل دل پیدا ہوں گے جن کی نظیر مدارس اور خانقاہوں میں نہیں ملے گی۔اوراس جماعت کا کسی تعداد میں بھی فراہم ہو جانا بڑی کامیابی ہے۔

مدارس کو اس تحریک سے متعدد فوائد حاصل ہوں گے، جو اس تحریک اور عمل کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ ان طلبہ کی غیر شعوری طریقہ پر دینی اور اخلاقی تربیت اور ان میں اسلامی جذبات کی پرورش ہوگی، اور بلا کسی اہتمام کے تبلیغ و اصلاح کی مشق و تربیت اور ایسا عملی تجربہ ہوگا جو کسی دارالتبلیغ میں حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسرا فائدہ علمی ہے، اور وہ یہ کہ قرآن وحدیث کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہے جو عمل و مجاہدہ کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا، جو چیزیں عملی ہیں وہ نظری طور پر کس طرح حاصل ہو سکتی ہیں؟ اس کے علاوہ حقائق کا صحیح انکشاف اور قلب کا حقیقی انشراح مشقت و جہاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ [سورة العنكبوت: ٦٩]

میں اس کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے، اس کام میں ایسے علوم ومضامین کا اِلقاء ہوگا اور حقیقت دین کا ایسا فہم صحیح حاصل ہوگا جو قرآن وحدیث کے درس میں اور کتابوں کے ڈھیر میں حاصل نہیں ہوسکتا۔

عربی زبان کی اشاعت

مدارس کی چاردیواری سے باہر علماء کا دوسرا فرض یہ ہے کہ ہندوستان میں عربی زبان کی اشاعت کی کوشش کریں اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ عربی زبان سیکھنے کا شوق دلائیں۔ دین کی صحیح حقیقت سمجھنے کے لیے، اس کے سرچشموں سے براہ راست سیراب ہونے کے لیے اور ان غلط فہمیوں اور بے اعتدالیوں سے بچنے کے لیے جن میں بہت سے دیندار، نیک نیت لیکن بہت سے واسطوں سے اسلام تک پہنچنے والے مسلمان مبتلا ہوتے ہیں، عربی زبان سیکھنا اور براہ راست قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ جدید تعلیم یافتہ اشخاص کی غیر متوازن مذہبیت اور ''علمی تحقیقات'' دیکھ دیکھ کر عربی زبان کی اہمیت اور اس کے ذریعہ سے اسلامی تعلیمات سے گہری اور براہ راست واقفیت کی ضرورت روز بروز آشکارا ہوتی جارہی ہے۔ اس لیے عربی زبان کی اشاعت ہندوستان جیسے ملک میں اسلام کی بہت بڑی خدمت اور اسلامی تہذیب اور کلچر کی حفاظت کا صحیح راستہ ہے۔

اس کام کے لیے علماء کو ترغیب وتشویق کے تمام مؤثر ذرائع استعمال کرنے ہوں گے، خواندہ عوام اور غیر عربی داں تعلیم یافتہ اشخاص کے لیے عربی زبان سکھانے کا آسان سے آسان طریقہ استعمال کرنا ہوگا، اور اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ ابتدائی مشکلات کو آسان کرکے کم سے کم وقت میں قرآن مجید سمجھنے کی اہلیت پیدا کردیں۔

اگر فلسطین میں مردہ عبرانی زبان اور ہندوستان میں مردہ سنسکرت زبان زندہ ہوسکتی ہیں، تو ہندوستان میں عربی زبان جو ابھی تک مردہ نہیں ہے، زندہ رکھی جاسکتی ہے اور اس کی اشاعت ممکن ہے۔ صرف عزم وکوشش اور تعاون کی ضرورت ہے۔

مدارس کی تنظیم اور علماء کا اجتماع

ان تمام مقاصد کے لیے ضروری ہے کہ عربی مدارس ایک سلسلے میں منسلک ہوں، اور ان کی تنظیم کی جائے، علماء کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ایک جگہ جمع ہوں، ایک دوسرے کے خیالات اور کوششوں سے واقف ہوں، اور اشتراک عمل کی صورتیں پیدا کریں، ندوۃ العلماء کی تحریک کا یہ ایک اہم مقصد تھا اور اس کے سالانہ جلسے علماء کے سب سے بڑے مرکز ہوتے تھے۔ اس کا دارالعلوم اور دارالعلوم دیوبند اب بھی اس تحریک و تنظیم کا مرکز بنائے جا سکتے ہیں، اور علماء اور عربی مدارس کے طلبہ اور نمائندوں کے ایک جگہ اجتماع کی مختلف مناسب تقریبیں پیدا کی جا سکتی ہیں، جن میں سے اردو اور عربی کے مباحثے، تقسیم اسناد کے جلسے اور بعض دوسرے علمی اجتماعات ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان بڑے مدارس میں ہندوستان کے چھوٹے بڑے مدارس کی مفصل فہرست ہو، تاکہ ان کو ضروری لٹریچر اور عام اجتماع کے دعوت نامے بھیجے جا سکیں۔ (۱)

---

(۱) ماخوذ از ماہنامہ "الندوہ" لکھنؤ (شمارہ جولائی، اکتوبر، دسمبر ۱۹۴۰ء)۔

ایک مثالی درس گاہ

انسانی فطرت کا غلط اندازہ

حضرات! قبل اس کے کہ میں اس مثالی درسگاہ کا تذکرہ کروں جو ہمارے اس مقالہ اور آج کی مجلس کا موضوع ہے، مناسب سمجھتا ہوں کہ دنیا کے دوسرے تعلیمی نظاموں اور درسگاہوں پر ایک نظر ڈال لی جائے اور ان کے بنیادی فرق کو محسوس کرلیا جائے۔

۱- دنیا کی قدیم وجدید درسگاہوں کی بنیاد ہمیشہ سے اس مفروضہ پر ہے کہ جمہور کے پاس وہ عقائد و یقینیات ہیں جن پر تعلیم کی بنیاد ہے، اور جو مبادی کا درجہ رکھتے ہیں، اس کو اپنی خامی، جہالت و ناتربیتی کا بخوبی احساس ہے، اور اس سے اس کو عقلی طور پر وہی تکلیف محسوس ہوتی ہے جو حسی طور پر ایک پریشان حال فاقہ زدہ انسان کو اپنی غربت یا بھوک سے، یا ایک مریض کو اپنے مرض سے محسوس ہوتی ہے۔

ان درسگاہوں اور تعلیمی مرکزوں کے بانی اور خادم جب اپنی مقدس تعلیمی مہم شروع کرتے ہیں، تو اپنی جگہ پر بڑی سادگی کے ساتھ یہ فرض کرلیتے ہیں کہ مبادی سے فرصت حاصل کی جاچکی ہے، اور احساس وطلب پیدا کرنے کی پہلی منزل طے ہوچکی ہے، اب صرف اس احساس وطلب کی تکمیل کی منزل درپیش ہے۔ قوم کی تہذیب وتمدن کے نظر فریب مناظر اور اس کی مادی ترقی وشائستگی کے شاندار مظاہر ان کو اس کا یقین دلاتے ہیں کہ قوم ذہنی اور عقلی واخلاقی احساس کے بلند درجہ پر فائز ہے۔ اس لیے وہ ان تعلیمی مرکزوں کو ٹھیک اسی اعتماد و ذہنیت کے ساتھ قائم کرتے ہیں جس اعتماد و ذہنیت کے ساتھ کوئی بھلا آدمی گرمی کے موسم میں سبیل لگاتا ہے یا کوئی مخیر شخص شہر میں کوئی شفاخانہ قائم کرتا ہے، اور اس کے منتظر

رہتے ہیں کہ لوگ اپنی ضرورتوں سے مجبور ہوکر اور اپنی خامیوں کو محسوس کر کے ان درسگاہوں کی طرف اسی احساس وطلب کے ساتھ رخ کریں گے اور وہاں بھی طالبین کا وہی ہجوم ہوگا جو پیاسوں کا کسی سبیل پر اور مریضوں کا کسی شفاخانہ میں روزانہ ہوتا ہے۔

لیکن یہ انسانی فطرت کا بہت غلط اندازہ ہے، عقلی وروحانی احساس ووجدان کو مادی و جسمانی احساس پر قیاس کرنا اور دونوں کو ایک دوسرے کا مماثل قرار دینا، یا کسی قوم کی تعمیرات، فنون لطیفہ کی ترقی یا معاشی جدوجہد وسلیقہ مندی سے یہ فرض کر لینا کہ اس کا ضمیر بیدار ہے، کچھ صحیح نہیں۔ ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں مادی فوائد کے حصول کی امید، اور سرکاری عہدوں اور ملازمتوں کی لالچ کسی قوم کو ان تعلیمی مرکزوں اور سرکاری درسگاہوں کی طرف مائل کر دے اور پوری قوم کی قوم یا اس کی بڑی تعداد ان مدرسوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے پر ٹوٹ پڑے، جیسا کہ ہم تعلیمی سال کے شروع ہونے پر دیکھا کرتے ہیں، لیکن اس سے یہ رائے قائم کر لینا صحیح نہیں ہے کہ عوام میں علم کی قدر و قیمت اور تعلیم کی ضرورت واہمیت کا احساس عام ہے۔ یہ دلچسپی بالکل سطحی اور عارضی ہے اور یہ اس کے ذہنی ارتقا، اخلاقی احساس اور تعلیمی ذوق کی مطلقاً دلیل نہیں۔ جس وقت قوم کے لیے اس تعلیمی نظام یا ان تعلیمی اداروں میں معاشی ترغیب وکشش باقی نہیں رہتی، اس کی ساری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے، اور یہ مقبول ومحبوب تعلیمی ادارے اس کی سرپرستی اور امداد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ قومی واصولی تعلیم گاہوں اور اصلاحی اداروں کو جو تعلیمی اور فنی حیثیت سے بہت کامیاب وممتاز لیکن ملازمتیں دلانے سے قاصر ہیں، اس کا خوب تجربہ ہے۔

اخلاقی وروحانی ضرورتوں کا احساس

انسانی تاریخ میں بہت کم ایسے دور آئے ہیں کہ جمہور کو اپنی اخلاقی وروحانی ضرورتوں کا احساس پورے طور پر ہوا ہو، اور اس کے دل میں ان کی تکمیل کا مخلصانہ تقاضا اور مطالبہ پیدا ہوا ہو، اور اُن کے حصول کے لیے اس نے وہی جدوجہد کی ہو جو وہ اپنی مادی ضرورتوں کے لیے کرتی ہے۔ عموماً یہ کسی پیغمبر کی بعثت یا کسی بڑے روحانی مصلح ومعلم کی تبلیغ اور اصلاحی

جدوجہد کے بعد ہوا ہے۔ان کے حلقۂ اثر میں اپنے نقائص کا بہ شدت احساس، اپنی اصلاح کا سچا جذبہ اور علم کے حصول کا حقیقی ذوق نظر آتا ہے، ان کو اپنی زندگی میں ایسا شدید خلا اور اپنی ذات میں ایسے بدنما داغ نظر آنے لگے کہ ان کو اپنے وجود سے خود شرم آنے لگی، ان کے پاس زندگی کی سب نعمتیں موجود تھیں، اور سکون واطمینان کا پورا سامان میسر تھا، لیکن علم کی کمی نے ان کو ایسا محسوس کرایا کہ گویا ان کی زندگی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خالی ہے۔ انھوں نے جب علم کے فضائل سنے اور یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی معرفت اور آخرت کی فلاح بھی صحیح علم پر منحصر ہے، تو انھوں نے علم کے حصول کو زندگی کا سب سے اہم اور مقدم کام سمجھا اور اس کی اس طرح فکر کی جس طرح ضروریات زندگی کی فکر کی جاتی ہے۔ان کی طلب کامل اور ان کے جذبۂ صادق نے ان کی طلب کی تکمیل کا سامان اس طرح پیدا کر دیا جس طرح پانی کا فطری مطالبہ اور زندگی کی اولین ضروریات کا احساس پیاس بجھانے اور زندگی کی ضروریات پوری کرنے کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

جن تعلیمی اداروں یا تعلیمی تحریکوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ پہلے لوگوں میں تعلیم کی ضرورت کا احساس اور علم کی طلب پیدا کی جائے، انھوں نے اول تو علم کو حرف شناسی اور خواندگی کا مرادف سمجھا، دوسرے انھوں نے صرف اپنے مخاطبین کے دماغوں یا حواس کو خطاب کیا، انھوں نے صرف اس کے مادی منافع اور مصالح بتلانے پر اکتفا کی۔وہ مجبور بھی تھے، ان کے پاس قلب وروح کو متاثر کرنے اور اس کو اندر سے بے چین و بے قرار بنانے کا کوئی سامان نہ تھا، ان کو تعلیم دینے کے مواقع تو حاصل تھے، مگر علم کے شوق اور عمل کے جذبات پیدا کرنے کے ذرائع حاصل نہ تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "توسیع تعلیم" کی کوشش کو پڑھے لکھے آدمیوں کا تناسب بڑھانے میں وہ کامیابی نہیں ہوئی جو ضروری علم دین کی اشاعت میں پیغمبروں اور دینی رہنماؤں کو ہوئی ہے۔

اس طریقہ کا دوسرا نقص یہ تھا کہ تعلیمی انتظامات کی فراہمی کی ذمہ داری اور ان کا بار تعلیم کی دعوت دینے والوں ہی کے سر رہا، اس لیے قوم نے علم کو اپنی زندگی کی غذا اور اپنے مرض

کی دوا نہیں سمجھا، بلکہ حکومت کا ایک فرض اور اس ادارے یا تعلیمی تحریک کا کام سمجھا جس نے تعلیمی مہم کو شروع کرنے کی "غلطی" کی تھی۔

علم وعمل کے لیے محرکات وجذبات کی ضرورت

۲- مدرسہ نے ہزاروں سال کی تاریخ اور تغیر وارتقاء میں اس حقیقت کو مسلسل نظر انداز کیا ہے کہ علم وعمل دونوں کے لیے محرکات وجذبات کی ضرورت ہے۔ محرکات وجذبات اور "محبت وعشق" کے بغیر مدرسہ کی پوری تعلیم اور کارکردگی محض الفاظ کی بے جان فہرست، کاغذ کے مردہ نقوش اور معلومات کا ایک جامد اور بے روح مجموعہ ہے، جس سے کسی فرد یا قوم کی زندگی میں ہرگز وہ فرق نہیں پیدا ہوسکتا جس کی بنا پر زمانۂ قدیم سے اس وقت تک علم کی اتنی تعریف کی گئی ہے، اور غیر تعلیم یافتہ انسان کو حیوان سمجھا جاتا رہا ہے۔

اس نے ہمیشہ اس نکتہ کو فراموش کیا کہ طاقتور محرکات یا جذبات طبی دماغ سے نہیں بلکہ زندگی کے اس مرکز سے پیدا ہوتے ہیں جس کو مذہب وزمان کے عالمگیر ادب میں "قلب" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس کو متاثر کرنے کے لیے وہ سامان واشخاص ہمیشہ کافی وموزوں نہیں ہوتے جو دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ قلب کو متاثر کرنے کے لیے ان صفات کے علاوہ جو دماغ کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہیں، کچھ مختلف صفات وکیفیات درکار ہیں۔

مدرسہ نے زمانۂ قبل مسیحؑ سے بیسویں صدی عیسوی تک برابر اس غلطی پر اصرار کیا ہے کہ دل کی جگہ بھی دماغ کی زائد مقدار سے پُر کی جاسکتی ہے، اور جذبات وکیفیات کی معلومات سے، روحانیت کی فلسفہ سے، عشق کی عقل سے، نظر کی خبر سے، حال کی قال سے، ذوق کی علم سے خانہ پُری کی جاسکتی ہے۔ اُس وقت سے جبکہ مدرسہ حروف پہچاننے اور کاغذ پر نقش بنانے کی تعلیم دینے کا ایک کارخانہ سمجھا جاتا تھا، اِس وقت تک کہ تعلیم کو مجموعی تربیت کا اور مدرسہ کو ایک زندہ معاشرتی ادارہ کا مرادف سمجھا جانے لگا ہے، مدرسہ کی تاریخ ملاحظہ ہو، اس بارے میں آپ کوئی تفاوت نہیں پائیں گے، بلکہ اس شعبہ میں روزافزوں تنزل وانحطاط نظر آئے گا۔

زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

اہل مدرسہ کو صدیوں سے اس کا تجربہ ہو رہا ہے کہ صحیح جذبات و محرکات کے بغیر ایثار و قربانی کی طاقت اور صبر و استقامت اور عمل کی وہ قوت نہیں پیدا ہوتی جو اس تعلیم کو نتیجہ خیز اور اس کے وسیع انتظامات اور شاہانہ مصارف کو حق بجانب ثابت کر سکے، اور تعلیم یافتہ انسان ان ترغیبوں اور تحریضوں پر فتح نہیں پا سکتا، جو اصول و اخلاق اور راہ راست سے برگشتہ کرنے کے لیے قدم قدم پر موجود ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں ایک غیر تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ انسان میں نفس کی ترغیبات کا مقابلہ کرنے اور اخلاقی امتحان میں ثابت قدم رہنے کی جو قوت تھی، آج ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک بڑی درسگاہ کے فاضل میں وہ قوت نظر نہیں آتی۔ ہم برابر دیکھ رہے ہیں کہ تعلیم یافتہ انسانوں کی ایک ایسی قطع پیدا ہوتی جا رہی ہے جس کے دل و دماغ کی تربیت میں کوئی تناسب نہیں، اس کا دماغ حکیموں اور فلسفیوں کا، اس کی زبان شاعروں اور ادیبوں کی، لیکن اس کا پہلو انسان کے دل سے خالی اور اس کی زندگی آدمیت و شرافت کے جوہر سے عاری ہے، اور وہ اقبال کے الفاظ میں ''شستہ رو تاریک جاں، روشن دماغ'' کی صحیح مصداق ہے۔ آج تعلیم کا ماحصل اس سے زائد نہیں جو اکبر نے دو لفظوں میں بیان کیا تھا کہ

ع زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

تعلیم یافتہ طبقہ اور صاحب اقتدار گروہ کے دل و دماغ کے اس عدم تناسب سے دنیا کی تہذیب و تمدن میں ایک ایسا عدم توازن پیدا ہو گیا ہے جس نے نظام عالم کو درہم برہم کر رکھا ہے، ان تعلیم یافتہ انسانوں کے اقتدار کے زمانہ میں اور تعلیمی وسائل اور اداروں کی اس کثرت کے دور میں (جس کی نظیر تعلیم کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے) دنیا میں اس سے زائد اخلاقی انحطاط اور تاریکی نظر آتی ہے جتنی نیم وحشی اقوام کی حکومت و اقتدار میں نظر آتی تھی، بیسویں صدی میں دنیا محض بیوپار کی ایک منڈی اور لوہار کی بھٹی بن کر رہ گئی ہے، جہاں ''درد''، ''عشق''، ''ایمان''، ''سیرت'' کی دولت، اور زندگی اور مذہب کی لطیف اور بلند ترین حقیقتیں اور اقدار ناپید ہوتی جا رہی ہیں، جہاں شکم پری اور تن پوشی کے علاوہ کوئی مقصد و معیار زندگی ہی نہیں معلوم ہوتا۔

لیکن اس کے باوجود مدرسہ کو اپنے نظام کی صحت اور اصول تعلیم کی صداقت پر اصرار ہے، اور اپنی غلط روی کا ابھی تک احساس نہیں، وہ برابر محسوسات اور بدیہیات کا انکار کر رہا ہے، اس نے سیکڑوں سال کے انقلاب و ارتقاء اور الٹ پھیر میں بہت سی ترمیمیں اور تغیرات اور نئے نئے تعلیمی تجربے کیے، لیکن اس مسئلہ میں ابھی تک اس نے قطعاً کوئی ترقی اور اصلاح نہیں کی، اور نہ اس سلسلہ میں کسی تجربے اور تغیر کے لیے وہ سنجیدگی کے ساتھ تیار معلوم ہوتا ہے۔

نظام تعلیم میں جو تغیرات یا اصلاحات پیش نظر ہیں، ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس قطع کے لوگ جو اس وقت تک پیدا ہوتے رہے ہیں، زیادہ تعداد میں اور تھوڑے وقت میں زیادہ آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکیں۔ لیکن حاشا یہ کسی کو خیال نہیں کہ اس نظام تعلیم میں مظلوم دل کے ساتھ انصاف کیا جائے اور اس کے غاصبوں سے اس کا حق دلایا جائے۔ ماہرین تعلیم کی مجلسوں میں اس مسئلہ کو اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں جو اقامت خانوں کے نظم و نسق اور فنون لطیفہ کی تعلیم کے چھوٹے چھوٹے جزئیات کو بھی حاصل ہے۔

نقوش کے بجائے نفوس کی ضرورت

۳- مدرسہ نے اپنی طویل ترین مدت میں تعلیم کا اصل ذریعہ ''نفوس'' کے بجائے نقوش کو سمجھا ہے، نفوس کو مدرسہ نے صرف اس حد تک ضروری سمجھا جس حد تک وہ نقوش کو کاغذ کے صفحات سے دماغوں تک منتقل کر سکیں، اس نے ان کی کامیابی و لیاقت کا معیار بھی یہی قرار دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نقوش کو کاغذ کی سطح سے اٹھا کر دماغ کی سطح پر منقش کر سکیں۔ اگر بعض تعلیمی مصلحتیں نہ ہوتیں اور ان تعلیم گاہوں کے منتظمین کا بس چلتا تو وہ اسباق کو رکارڈ کر کے طلبہ کو سنانے کا انتظام کر دیتے اور انسان کو بیچ میں سے بالکل نکال دیتے، لیکن ابھی اس ترقی میں دیر معلوم ہوتی ہے، اگرچہ متکلم تصاویر نے اس مسئلہ کو بہت حد تک آسان بنا دیا ہے۔

یہ سب دراصل اس بنیادی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ علم نوشت و خواند اور مجرد معلومات کا نام

ہے، اگر علم انسانی استعدادوں اور صلاحیتوں کے معتدل نشو ونما، اور جسم دماغ، دل اور روح تینوں کی متوازن تربیت کا نام ہوتا تو ''مدرسہ'' انسانی نفوس کو اہمیت میں دوسرا درجہ نہ دیتا، اور مدرسہ کے طالب علم قدرت کی ان عظیم طاقتوں اور دولت کے معمور خزانوں سے محروم نہ رہتے جو خالق فطرت نے انسانوں کے قلوب میں ودیعت کیے ہیں، اور جو کسی پہاڑ کے دامن یا کسی زمین کی تہہ میں نہیں پائے جاتے، وہ انسانی قلوب کے ان سمندروں اور ان کے عجائبات سے کچھ نہ کچھ آشنا ہوتے جن کی تھاہ ابھی تک کوئی نہیں پا سکا اور ان کی گہرائی تک کوئی غواص نہیں پہنچ سکا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو متعدی طاقتیں اور صفات رکھے ہیں، جنھوں نے اکثر دنیا کو روشنی اور حرارت سے بھر دیا ہے، مدرسہ ان کی تربیت سے پھر ان کے منتقل کرنے سے برابر غفلت برتتا رہا ہے۔ قدیم مشرقی مدرسہ میں معلم کی شخصیت پھر بھی محبوب اور مقتدیٰ تھی، اور اس سے طالب علم کو اچھا خاصا لگاؤ اور قلبی تعلق رہا ہے، جس نے کبھی شیفتگی اور فنا و محویت کا درجہ حاصل کر لیا ہے، اور تاریخ نے ہمیں ایسے واقعات بھی سنائے ہیں کہ معلم کی غلط خبر وفات پر اس کے بعض شاگرد شدت غم سے مر گئے، یا روتے روتے ان کی آنکھیں جاتی رہیں، مگر مغرب کے مادہ پرست نظام تعلیم نے اس قلبی تعلق کو بھی ختم کر دیا ہے۔

اس زمانہ میں مدرسہ کو ایک خوشگوار خاندانی ماحول میں منتقل کرنے اور اس کو ایک خوش اسلوب متعاون جماعت کی شکل میں مرتب کرنے کی طرف رجحان پایا جاتا ہے، لیکن اس کی تکمیل و تشکیل کے لیے جو ذرائع سوچے جاتے ہیں وہ تقریباً میکانکی اور قانونی ہیں۔ دل کو ڈھالنے اور درد و سوز اور عشق کی حرارت پیدا کرنے میں بیسویں صدی کی سائنس نے ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں کی ہے اور یہ متاع اس وقت تک بازار میں نہیں آئی جہاں سے خرید کر مدرسہ میں رکھ دی جائے۔ اس لیے ابھی تک مدرسہ میں حقیقی زندگی کی روشنی اور روحانی تعلق کی گرمی پیدا نہیں ہوئی، اور وہ ایک مصنوعی ماحول سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

نقوش کبھی نفوس کے قائم مقام نہیں ہو سکتے، کتابی نقوش میں روح اور حرکت نہیں، وہ

جامد اور متحجر ہیں، ان میں زندگی میں گھل مل جانے کی قابلیت نہیں، اور کاغذی لباسوں میں ہر قامت پر راست آنے کی صلاحیت نہیں، ان کے ساتھ زیادہ کشمکش کی گئی تو وہ تنگ کپڑے کی طرح مَسک جائیں گے، مگر ڈھیلے نہیں ہوں گے۔

انسان کی زندگی متحرک اور منقلب ہے، اس کے ساتھ وہی چل سکتا ہے جس میں حرکت اور ترقی ہو۔ یہ کاغذی نقوش محدود و مقید ہیں، ان کے مصنفین نے ان کو کاغذ کے سپرد کر کے ان پر ایسے قفل چڑھا دیے ہیں کہ وہ خود بھی ان کو کھول نہیں سکتے، لیکن انسان کی زندگی تغیرات سے بھری ہوئی ہے، انسان کے دماغ کی سلوٹیں اور اس کے دل کی شکنیں غیر محدود ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس پانی کی سطح پر کس وقت کون سی لہر آئے گی، ان سلوٹوں کو دور کرنے کے لیے اور دل کی شکن کھولنے کے لیے کسی زندہ انسان کی نگاہ چاہیے، جس کے بوجھ کو بچہ کا نازک دل، ناکام زخمی قلب اور طالب علم کا تھکا ہوا دماغ بھی محسوس نہ کرے، وہ دل کے غلافوں کو اس طرح کھولتی چلی جائے جس طرح نسیم سحر کا ایک لطیف جھونکا نرگس کی آنکھ اور غنچہ کا دہن کھول دیتا ہے۔ اس کے لیے کبھی وہ جواب چاہیے جس کو انسان کے کان سے پہلے اس کا دل سن لے، اس کے لیے کبھی گویائی مفید ہے کبھی خاموشی، کبھی دلیل مفید ہے کبھی وجدان، کبھی تجربہ مفید ہے کبھی ایمان، اور ایک روشن ضمیر اور صاحب دل ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس وقت کیا مناسب ہے۔

زندگی کے حقائق و تجربات کے مخففات کی تعلیم

۴- اب ایک اور حقیقت پر غور کیجیے، مدرسہ میں جو علوم الفاظ کی شکل میں پڑھائے جاتے ہیں، وہ دراصل زندگی کے حقائق و تجربات کے مخففات ہیں، یعنی زندگی کے حقائق و تجربات کو چند اصطلاحات یا علامات کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے، یوں سمجھئے کہ ایک ضخیم کتاب کو جمل کے اعداد میں منتقل کر دیا گیا ہے، غالباً طوالت و اختصار کی جو نسبت ایک صفحہ اور اس کے اعداد کے مجموعہ میں ہے یا مثال کے طور پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور اس کے عدد ۷۸۶ میں ہے، اس سے بڑی نسبت اور عظیم تفاوت ان عملی اور تجربی حقائق اور ان کے علمی و

اصطلاحی علامات میں ہے جو مدرسہ میں رائج ہیں۔ یہ علمی و اصطلاحی علامات بلاشبہ اس شخص کے لیے ایک قلمی یادداشت کا کام دے سکتے ہیں جو ان کا عملی تجربہ کر چکا ہے اور ان کی عملی وسعتوں سے آشنا ہے۔ یہ درحقیقت ایک ایسے سیاح کی مختصر یادداشت ہے جو ہزاروں میل کا رقبۂ زمین طے کرتے ہوئے شہروں اور قصبات کے نام، ان کی نمایاں خصوصیات، سمتوں، فاصلوں یا موٹی علامات کے ساتھ درج کر لیتا ہے، تاکہ ان کو دیکھ کر اس کے حافظہ میں ان کی یاد تازہ ہو جائے۔ وہ جب ان پر نظر ڈالتا ہے تو تصویر کی طرح وہ سارے شہر اور مناظر اور ان کی خصوصیات آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں، اور چند منٹ میں وہ اس پورے رقبہ کے گرد چکر کر لیتا ہے جو اس نے کئی سال کی سیاحت میں طے کیا ہے۔ اس کا ہر نام اس کے لیے مشاہدات و تاثرات کی ایک مستقل دنیا اور دلچسپیوں کا ایک مرقع ہے، جو اس کے نفس میں مخصوص ذہنی و جذباتی کیفیات پیدا کر دیتا ہے۔ کسی کو دیکھ کر وہ ہنسنے لگتا ہے، کسی منظر کے تصور سے وہ آبدیدہ ہو جاتا ہے، کہیں اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک اور کہیں اس کی پیشانی پر نفرت کی شکن پیدا ہوتی ہے۔

یہی حال زندگی کی حقیقتوں، اخلاق کے اصول اور تجربات اور صدہا معانی و مضامین کا ہے، وہ شہروں سے کہیں زیادہ وسیع، لطیف، لوچدار اور پھل جانے والے اور الفاظ کی آہنی و سنگین گرفت سے جس میں بہت کم لوچ ہے، نکل جانے والے ہیں۔

لغت کے مرتبین و مصنفین نے ان کے معانی بیان کرنے کے وقت اور ان کے لیے مناسب علمی علامات وضع کرنے میں جن کو اب مفردات کہتے ہیں، بڑی دقتیں محسوس کی ہوں گی، ان کو قدم قدم پر اپنے عجز و درماندگی اور قلم کی گنگ بیانی کا تجربہ ہوا ہوگا، لیکن ان کو بہرحال انسانی تمدن کا یہ لازمی فریضہ (ترتیب لغت کا کام) انجام دینا تھا، اس لیے انھوں نے حقائق و معانی کا ایک ناقص اور نا کام ترجمہ کر دیا کہ ''علم شے بہ از جہل شے'' (کسی چیز کا جاننا نہ جاننے سے بہتر ہے)، انھوں نے ان وسیع معانی کے لیے بہت محدود الفاظ وضع کیے، اور وسیع الفاظ کے بہت محدود معانی بیان کر سکے۔ یہ الفاظ و مفردات مردہ ہیں، ان میں

طالب علم یا خواندہ آدمی کی ذہانت، تجربہ یا قیاس ہی جان ڈال سکتا ہے۔ ان چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے جن میں حکایت صوت پائی جاتی ہے یا ان کی ساخت کسی معنی کی مصوری اور غمازی کرتی ہے، عام الفاظ و معانی میں کوئی مادی و محسوس مشابہت نہیں کہ ان کے دیکھنے سے یا سننے سے لازماً ان کے معنی کا تصور پیدا ہو جائے، یہ مشابہت محض وضعی اور اصطلاحی ہے، خوف، محبت، شرافت، دیانت کے الفاظ سن کر ذہن کا ان کے معانی کی طرف منتقل ہونا محض ایک تجربہ پر مبنی ہے، جو سننے والے کو اپنی لسانی واقفیت یا عملی زندگی میں حاصل ہے۔ یہ تجربہ جتنا وسیع اور متنوع ہوگا اسی قدر اس کا ذہن اس میں وسیع اور متنوع معانی پیدا کرے گا، ورنہ بڑے سے بڑے لغت میں ''خوف'' کے معنی دولفظوں میں بیان کر دیے گئے ہوں گے، لیکن کیا اس سے اس کی تمام کیفیات، اس کے گوناگوں تجربات اور اس کے ضروری متعلقات ذہن میں آسکتے ہیں؟

ایک مثالی مدرسہ

حضرات! ہم نے اصطلاحی مدرسہ کے امتیازی خصوصیات اور اس کے کمزور پہلوؤں پر ایک نظر ڈال لی، اب تعلیم و تربیت کے اس طریق پر نظر ڈالیے جو نوع انسانی کے سب سے بڑے معلم اور مربی انبیاء (علیہم السلام) نے اختیار کیا ہے، ہم اس تقابل کے لیے سیدنا محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد مبارک اور مکہ معظّمہ و مدینہ طیّبہ کے تربیتی مرکزوں کو انتخاب کرتے ہیں کہ پیغمبرانہ طرز کی نمائندگی کے لیے اس سے بہتر عہد اور مقام نہیں مل سکتا، اور تاریخ اور دینیات کے ذخیرہ نے صرف اسی عہد کی تفصیلات اور اس کے صحیح خدوخال محفوظ رکھے ہیں۔

اصطلاحی مدرسہ اور صناعی طریقۂ تعلیم کے برخلاف ہر پیغمبر کی طرح جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام بھی کسی مجرد تعلیمی دعوت یا کسی تعلیمی مرکز کے افتتاح یا کسی نصاب تعلیم کی ترتیب یا معلمین کے انتخاب سے شروع نہیں ہوتا، بلکہ ایمان اور مستقل دین کی

دعوت سے شروع ہوتا ہے۔ آپ نے چند حقیقتوں پر ایمان لانے کی عام دعوت دی، اور اس کے لیے انتہائی دل نشین، عام فہم اور عمومی طریقے اختیار کیے، جو اپنی معنوی بلندی اور معجزانہ خصوصیات کے ساتھ لوگوں کی ذہنی سطح سے پورا تناسب رکھتے تھے، اور ان کی عقلِ عملی اور فہم عام کے بالکل مناسب تھے۔ کوہ صفا کا پہاڑی وعظ جو نبوت کی بہترین عام فہم مثال ہے، اور جس کی نظیر پیغمبروں کے حکیمانہ مواعظ اور امثال کے ذخیرہ میں نہیں ملتی، اس کی بہترین مثال ہے۔ دعوت کے اس مرحلہ پر آپ نے کسی عجلت اور رواداری سے کام نہیں لیا بلکہ مکہ معظّمہ کے تیرہ سال زیادہ تر اسی ایمان و یقین کے پیدا کرنے میں صرف ہوئے۔

جن لوگوں میں آپ کی سیرت کی تاثیر، صحبت کے فیض اور قرآن مجید کے اثر سے ایمان و یقین کی یہ قوت پیدا ہوگئی اور ان کے قلب و دماغ میں ہر ایسی چیز کے جذب کر لینے اور امانت کے ساتھ محفوظ رکھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی جو ان کے نزدیک علم و یقین کے سرچشمہ سے آئی ہے، ان کے قلوب شک و تذبذب، ان کے دماغ اشتباہ و اضطراب، اور ان کے قویٰ بےعملی و تعطّل سے پاک ہوگئے، صحیح بات پر یقین کرنے اور پھر اس یقین پر جان دے دینے کی ان میں عادت پیدا ہوگئی، ''ثواب''، ''رضائے الٰہی''، ''نجات اُخروی''، ''فلاحِ دارین'' کے الفاظ میں ان کے لیے مقناطیس کی کشش پیدا ہوگئی، کسی چیز کی دینی فضیلت اور اخروی ثواب کا گمان ان کے قوائے دینی و عملی کے لیے دنیا کی سب سے بڑی محرک طاقت بن گئی، جو ان کی تمام خواہشات، عادات، مصالح اور دنیاوی و نفسیاتی ترغیبات پر آسانی سے فتح پالیتی تھی، دلوں میں عشق کی چنگاری اور محبت کی حرارت پیدا ہوگئی جو اُن سے وطن و دیار کو چھوڑا سکتی تھی، اور دنیا کی ہر رکاوٹ اور مزاحمت کے خس و خاشاک کو جلا سکتی تھی۔ اس وقت آپ نے ان کو بتلایا کہ دین کی اساس صحیح علم پر ہے، علم کے بغیر خدا کی معرفت، اس کے احکام و قوانین کی واقفیت اور اس کی رضا مندی و نارضا مندی سے آگاہی ممکن نہیں، اور اس کے بغیر صحیح عمل اور دینی سیرت کا حصول عادۃً محال ہے، یہی وہ پیغمبرانہ تربیت تھی جس کو صحابہ کرام نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"تَعَلَّمْنَا الْإِيْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ"(۱)

"ہم نے پہلے اللہ ورسول کی باتوں پر یقین کرنا سیکھا، پھر قرآن سیکھا۔"

اس مرحلہ پر آپ نے ان میں ایک بہتر زندگی کی تمنا اور اس کا شوق وولولہ پیدا کیا، ان میں اندر سے اپنی موجودہ حال سے بے اطمینانی اور اپنے ماحول میں بے چینی و بے قراری پیدا کردی، ان کی روح پیاسی ہوگئی، اور دل کی گہرائی میں بے اطمینانی کی پھانس چبھنے لگی، ان کو اپنی زندگی کے اندر ایک ایسا خلا محسوس ہونے لگا جو صرف علم سے پُر ہوسکتا تھا، ان کو حصول علم کے بغیر ہر دن خطرہ کا اور موت جاہلیت کی نظر آنے لگی۔

انھوں نے وحی کے یہ الفاظ سنے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [سورة الزمر:۹]

"کیا صاحب علم اور جاہل برابر ہوسکتے ہیں؟"

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [سورة فاطر:۲۸]

"اللہ سے علم رکھنے والے ہی ڈرتے ہیں۔"

﴿وَمَا يَعْقِلُهَآ إِلَّا الْعَالِمُوْنَ﴾ [سورة العنكبوت:٤٣]

"ان باتوں کو علم والے ہی سمجھتے ہیں۔"

علم کے فضائل

آپ نے اس کے ساتھ ان کو علم کے فضائل سنائے، یہ وہ محرک طاقت تھی جس سے زیادہ طاقتور، زیادہ دیرپا، جس سے زیادہ گہرے محرک کا دنیا نے آج تک تجربہ نہیں کیا، اور اس سے بہتر نتائج کسی جذبہ نے انسانیت کی پوری تاریخ میں ظاہر نہیں کیے۔ آپ نے اس موقع پر نہ تو مادی منافع کا ذریعہ اختیار کیا، جو ذہن پر بہت عارضی اور سطحی اثر ڈالتا ہے اور

---

(۱) روى ابن ماجه في سننه عن جندب بن عبدالله قال: كنا مع النبي (ﷺ) و نحن فتيان حزاورة، فتعلمنا الإيمان قبل أن نتعلم القرآن، ثم تعلمنا القرآن، فازددنا به إيماناً. (كتاب السنة ، باب في الإيمان،حديث رقم ٦١)

صرف انسان کے حیوانی احساس کو بیدار کرتا ہے جو بہت جلد سو جانے والا ہے، نہ حکمائے یونان کی طرح خشک و بے روح عقلی فوائد کا تذکرہ کیا جو انسان کی روح اور قلب کو مس کیے بغیر دماغ کے اوپر اوپر سے چلے جاتے ہیں۔ آپ نے اس کے لیے ایسی زبان میں گفتگو فرمائی اور انھیں ترغیبات کو اختیار فرمایا جو پیغمبر اور ان کے جانشین ہمیشہ اختیار کرتے رہے ہیں، اور انسان کی قوت ارادی کو اس سے زیادہ حرکت میں لانے والی اور اس کی قوت عمل کو بیدار کرنے والی کوئی تعبیر و اصطلاح اور کوئی ترغیب و تحریک نہیں۔ ان فضائل کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ علم سے ان لوگوں کو دائمی تعلق پیدا ہو گیا، اس لیے کہ وہ فضائل دائمی تھے، اور جس ذات کی نسبت سے ان میں فضیلت پیدا ہوتی ہے وہ ابدی اور سرمدی ہے۔

آپ (ﷺ) نے فرمایا: ''جو طلب علم کے راستہ پر چلے گا، اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دے گا۔''(۱)

''جو طلب علم میں نکلے گا، وہ جب تک واپس نہ آ جائے، اللہ کے راستہ میں شمار ہو گا۔''(۲)

''طلب علم پچھلے گناہوں کا کفارہ ہے۔''(۳)

''دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں اللہ کی رحمت سے دور ہیں، سوائے اللہ کے ذکر(۴)، اس کے متعلقات اور عالم و طالب علم کے۔''(۵)

''عالم کو عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو مجھے ادنیٰ امتی پر۔''(۶)

''فرشتے طالب علم کے کام سے خوش ہو کر اس کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں، عالم کے لیے آسمان و زمین کی مخلوقات یہاں تک کہ مچھلیاں پانی میں مغفرت چاہتی ہیں، عالم کی فضیلت عابد پر وہی ہے جو چاند کی ستاروں پر ہے، علماء انبیاء کے جانشین ہیں، انبیاء نے اپنے ترکہ میں دینار و درہم نہیں چھوڑے، انھوں نے اس علم کی میراث چھوڑی، زہے نصیب

---

(۱) رواه مسلم (٦٨٥٣) و الترمذي (٢٦٤٦) (۲) رواه الترمذي (٢٦٤٧)

(۳) رواه الترمذي (٢٦٤٨)

(۴) جو کام اللہ کی اطاعت و رضا کے لیے شرعی طریقہ پر کیا جائے، وہ سب ذکر ہے۔

(۵) رواه الترمذي (٢٣٢٢) (۶) رواه الترمذي (٢٦٨٥)

جس کے حصہ میں یہ آئے۔"(۱)

"یا عالم بنو یا طالب علم یا غور سے سننے والا، یا ان سے محبت رکھنے والا۔ جو ان میں سے کوئی نہیں، وہ خطرہ میں ہے۔ (۲)

"عالم وطالب علم دونوں اجر میں شریک ہیں، اور ان کے علاوہ کسی میں خیر نہیں۔"(۳)

ان فضائل نے صحابہ کرام کو علم و تعلم کے عشق میں ایسا سرشار کردیا کہ انھوں نے اس کے لیے نہ موسم کی سختیاں دیکھیں، نہ ملکوں کے فاصلے اور مسافتیں۔ ان کو یقین تھا کہ وہ بڑی فضیلت والی عبادت میں مشغول ہیں، اس لیے وہ اس کو اسی ذہنیت ونیت، اسی جذبہ وشوق اور اسی صبر ومجاہدہ کے ساتھ انجام دیتے جس ذہنیت ونیت کے ساتھ وہ نماز وحج کے فرائض انجام دیتے۔

زر بن حبیش کہتے ہیں: میں صفوان بن عسال کے پاس موزوں پر مسح کرنے کا مسئلہ سننے گیا، صفوان نے مجھ سے کہا: کیسے آئے؟ میں نے کہا: علم کی طلب میں۔ فرمایا: فرشتے طالب علم کے عمل سے خوش ہوکر اس کے لیے پر بچھاتے ہیں۔ (۴)

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملتی کہ فلاں صحابی کے پاس ایک حدیث ہے، ہوسکتا تھا کہ میں ان کو بلا بھیجوں، وہ فوراً تشریف لے آتے اور مجھے حدیث سنا دیتے، لیکن میں خود چل کر جاتا، ان کے دروازہ پر جاکر دوپہر کے وقت پڑ جاتا، جب وہ نکلتے تو میں حدیث سنتا۔ (۵)

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک حدیث کی اطلاع ملی جو صرف ایک صحابی کے پاس تھی، میں نے اونٹ خریدا، اس پر کجاوہ کسا، پھر مہینہ بھر چل کر شام پہنچا، وہاں عبداللہ بن انیس انصاری کے مکان پر آیا اور ان کو اطلاع کی کہ جابر دروازہ پر حاضر ہے، انھوں نے

---

(۱) رواہ أبوداود (٣٦٤١) و الترمذي (٢٦٨٢)

(۲) جامع بيان العلم و فضله لابن عبد البر الأندلسي، رقم ١١٣، ص: ١/ ٧٣

(۳) جامع بيان العلم و فضله لابن عبد البر الأندلسي، رقم ٩٦، ص: ١/ ٦٦

(٤) رواه الترمذي (٣٥٣٥)

(٥) جامع بيان العلم و فضله لابن عبد البر الأندلسي، ص: ١/ ١٨٨

کہلوایا کہ کیا جابر بن عبداللہ؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! وہ فوراً تشریف لائے، ہم دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا، میں نے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ایک حدیث حضور سے سنی ہے اور مجھے اس کے سننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، اسی غرض کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ (۱)

ابو ایوب انصاریؓ حضرت عقبہ بن عامر کے پاس ایک حدیث سننے کے لیے مصر تشریف لے گئے، انھوں نے سنا تو ملنے کے لیے آئے، حضرت ابو ایوب نے فرمایا کہ ایک حدیث آپ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنی ہے، اس وقت آپ کے سوا اس کا سننے والا نہیں ہے، اسی کے معلوم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ (۲)

علم کی اس اہمیت اور فضائل کی وجہ سے ضروری علم حاصل کرنا اس دور کے ہر مسلمان نے اپنا ذاتی کام اور اپنی زندگی کی ایک اہم ضرورت سمجھ لی تھی، جس کی ذمہ داری ہر شخص فرداً فرداً اپنے اوپر سمجھتا تھا، اور وہ کسی ادارہ یا جماعت یا حکومت کی طرف نہیں دیکھتا تھا، وہ اس کے لیے وہی فکر واہتمام کرتا جو مادی ضروریات زندگی، خورد ونوش اور لباس ومکان کے لیے کیا جاتا ہے۔

ایک طرف آپ نے عام مسلمانوں کو طلب علم اور دین سیکھنے کے فریضہ کی طرف متوجہ کیا اور اس کا بوجھ خود ان کے کاندھوں پر ڈلا، ان کو خود اپنی اس ذاتی ضرورت کا احساس دلایا اور اس کا طالب بنایا، دوسری طرف علم رکھنے والوں کو ان کا فریضہ بتایا اور ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا، اور جو خود جانتے ہیں اس کو دوسروں کو سکھانے کے فضائل سنائے اور علم میں بخل وسکوت کے خطرات سے ڈرایا۔

آپ نے فرمایا: ''اللہ اور اس کے فرشتے آسمانوں اور زمین کی مخلوقات، یہاں تک کہ چیونٹیاں سوراخوں میں اور مچھلیاں لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والوں کے حق میں دعا کرتی

---

(۱) جامع بيان العلم و فضله لابن عبد البر الأندلسي، رقم ٣٧٠، و رواه أحمد في مسنده، ٤٩٥/٣، (رقم (١٦١٣٨)

(٢) جامع بيان العلم و فضله لابن عبد البر الأندلسي، ص: ١٨٧/١

ہیں۔''(۱)

''رشک کا موقع دو آدمیوں پر ہے، ایک وہ جس کو اللہ نے مال دیا اور وہ حق کے راستہ میں اس کو صرف کرنے پر اترا ہوا ہے، دوسرا جس کو اللہ نے حکمت عطا فرمائی، وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔''(۲)

''اللہ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے ہم سے کچھ سنا اور جیسا سنا دوسروں تک پہنچا دیا، ایسا بہت ہوتا ہے کہ جس کو پہنچایا گیا ہے وہ اس سے زیادہ سمجھنے اور یاد رکھنے والا ہو جس نے اپنے کانوں سے سنا۔''(۳)

''میری طرف سے دوسروں کو پہنچاؤ، چاہے ایک ہی آیت۔''(۴)

''جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی اور اس نے چھپائی، قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی''۔(۵)

مدینہ کی پوری نو آبادی ایک غیر اصطلاحی مدرسہ تھی

ان دوطرفہ فضائل اور تاکیدوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ کی پوری مسلمان نو آبادی ایک غیر اصطلاحی مدرسہ میں تبدیل ہوگئی، جس کا ہر فرد یا تو طالب علم تھا یا معلم، اور بعض اوقات ایک ہی شخص اپنے لیے طالب علم تھا اور دوسرے کم جاننے والوں کے لیے معلم۔ دنیا کی تعلیمی تاریخ میں بغیر کسی مادی اہتمام و صرف اور بغیر کسی جبر و تشدد کے پوری آبادی کے مدرسہ کی زندگی میں منتقل ہو جانے کی یہ ایک شاذ مثال تھی، جس کی نظیر شاید نہ مل سکے۔

اس وقت کا کوئی کاشتکار، تاجر، مزدور، باغ و جائداد کا مالک، ملازم، غلام، مرد اور عورت تعلیم سے مستثنیٰ نہ تھا، وہ دن اور رات کے کسی نہ کسی حصہ میں ضرور تعلیم حاصل کرتا تھا۔ ان

---

(١) رواه الترمذي (٢٦٨٥)

(٢) رواه البخاري (٧٣، ١٤٠٩، ٧١٤١، ٧٣١٦) و مسلم (١٨٩٦)

(٣) رواه الترمذي (٢٦٥٧)، (٤) رواه البخاري (٣٤٦١)

(٥) رواه الترمذي (٢٦٤٩)

میں ایک جماعت ایسی تھی جو باقاعدہ طالب علم یا عالم کہلاتی تھی، وہ دن کو مزدوری یا تجارت کرتے تھے اور رات کو پڑھتے تھے۔

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ جن کو ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں "قراء" (طالب علم یا عالم) کے نام سے پکارتے تھے، وہ تعداد میں ستر تھے، رات کو وہ مدینہ میں اپنے استاد کے پاس جاتے اور صبح تک پڑھتے رہتے، صبح کو ان میں جو طاقتور ہوتے وہ میٹھا پانی بھر کر لاتے اور مزدوری کرتے، یا لکڑی کاٹ کر لاتے اور فروخت کرتے، جن کو گنجائش ہوتی وہ جمع ہو کر بکری خرید لیتے، اس کو بناتے اور وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حجروں کے پاس لٹکی رہتی۔ (۱)

مجالس نبوی میں شرکت کا اہتمام

ان باضابطہ طالب علموں کے علاوہ مدینہ کی آبادی کا ہر فرد طالب علم تھا۔ اس مدرسہ کا سب سے بڑا حلقۂ درس اور سب سے عمومی جماعت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجلس مبارک تھی، جس کا شریک درس دنیا کا سب سے بڑا معلم، فقیہ اور حکیم بن کر نکلا۔

اس مجلس میں صحابہ کرام کو شریک ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کا اتنا اہتمام تھا کہ بعض لوگ روزانہ مجلس نبوی میں حاضر نہ ہو سکتے تو باری باری سے ایک دن حاضر ہوتے اور جو کچھ اس مجلس میں پیش آتا اس کی اطلاع اپنے رفیق کے ذریعہ حاصل کرتے، جس دن وہ حاضر نہ ہو سکتے اس دن ان کو ایک بے کلی سے رہتی اور انتظار رہتا کہ آج وہاں کیا پیش آیا اور لوگوں نے آج کیا درس لیا۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: میں اور میرا انصاری پڑوسی بنی امیہ بن زید کے محلہ میں (جو مضافات مدینہ میں تھا) رہتے تھے، ہم دونوں باری باری آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجلس میں حاضر ہوتے، ایک دن وہ حاضر ہوتا اور ایک دن میں، جس دن میں حاضر ہوتا اس دن کی اطلاع اور احکام وغیرہ اس کو پہنچا دیتا، اور جس دن وہ حاضر ہوتا اس دن کی اطلاعات

(۱) رواہ الإمام أحمد بن حنبل في مسنده ۳/۲۷۰ — حدیث رقم ۱۲۴۲۹

اور احکام مجھے پہنچا دیتا۔ [۱]

تعلیم میں قوت اخذ اور فہم کے مراتب کا لحاظ

صحابہ کرام معاشرت کے احکام، اخلاق و عادات اختلاط و صحبت کی زندگی سے ٹھیک اسی فطری و طبعی طریق سے حاصل کرتے تھے جس طرح اہل زبان میں رہ کر زبان سیکھی جاتی ہے، اور مہذب و شائستہ لوگوں کی صحبت میں سلیقہ، حسن معاشرت اور آداب زندگی کی تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔

یہ علم ان کے قوائے عقلی اس طرح ہضم کرتے تھے جس طرح طبعی غذا کو تندرست آدمی ہضم کر لیتا ہے، اگر اس میں ارتقاء اور اضافہ تھا تو وہ طبعی اور تدریجی تھا، جس کا باران کا دل و دماغ بالکل محسوس نہیں کرتا تھا، اس میں نہ صرف ان کے عقلی ہضم کا لحاظ رکھا جاتا تھا بلکہ ان کی طبعی طلب اور شوق کا بھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کے سامعین نے فرمائش کی کہ وہ روزانہ ان کو مستفید فرمایا کریں، فرمایا: ''رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں ناغہ ناغہ سے ہدایتیں اور نصائح فرمایا کرتے تھے کہ کہیں ہم اکتا نہ جائیں۔'' [۲]

فقہائے صحابہ اور حکمائے امت اس بارے میں قوت اخذ اور فہم کے مراتب کا بھی لحاظ رکھتے تھے اور مختلف سطح سے بات کرنا اور تعلیم دینا ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کے عقل و فہم کے درجہ اور سطح کے مطابق بات کرو، کیا یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ و رسول کی باتوں کو جھٹلانے لگیں؟

مدینہ طیبہ کے اس طبعی مدرسہ میں اگرچہ عملی تعلیم کا سلسلہ شب و روز جاری رہتا تھا، لیکن پھر بھی محلوں کا تفاوت، کاروبار کی مشغولیت، مشاغل زندگی کا تنوع و اختلاف پورے اختلاط، ایک دوسرے کے مطالعہ اور استفادہ میں کسی حد تک حارج تھا۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب المظالم، باب الغرفة و العلية، حديث رقم ٢٤٦٨

(٢) رواه البخاري، كتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة، رقم (٧٠)

چلتا پھرتا مدرسہ

لیکن مدینہ طیبہ کی زندگی میں بڑی کثرت سے اس کے مواقع آتے تھے کہ یہ دیواریں درمیان سے ہٹ جاتیں اور آبادی کا بڑا حصہ ایک وسیع دارالاقامہ میں تبدیل ہو جاتا جہاں سب ایک جگہ رہتے، ایک جگہ سوتے، ایک جگہ کھاتے، ایک جگہ نماز پڑھتے، ایک دوسرے کو اس کی طبعی و بے تکلف حالت میں اس کے اصلی اخلاق اور طبیعت کے مظاہر میں دیکھتے، طبقات کی اونچ نیچ پہلے بھی نہ تھی، لیکن اس موقع پر بالکل ہی باقی نہ رہتی۔ یہ سفر جہاد کے مواقع تھے جو ہجرت کی زندگی میں بہت جلد جلد پیش آتے۔ ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مدینہ طیبہ کے دس سال کی مدت میں ستائیس بار ایسے مواقع پیش آئے ہیں کہ جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خود مدینہ طیبہ سے باہر نکلے ہیں اور مسلمانوں کی بڑی جمعیت آپ کے ساتھ تھی۔ بعض مواقع ایسے بھی پیش آئے کہ مدینہ منورہ میں چند متنفس ہی باقی رہ گئے جو کسی عذر کی وجہ سے باہر نہ جا سکے، مثلاً تبوک کی مہم جو شام کی سرحد پر پیش آئی، آخری حج اور فتح مکہ، ان کے علاوہ کئی سو کی تعداد میں وہ مہمیں ہیں جن میں آپ بنفس نفیس شریک نہیں تھے، صحابہ کرام تنہا گئے۔

ان سفروں میں فقہ کے احکام اور شریعت کے مسائل اعمال میں منتقل ہو جاتے، معقولات محسوسات بن جاتے، مفروضات واقعات ہو جاتے اور مسموعات مشاہدات کی شکل اختیار کر لیتے۔ اب تعلیم سراسر تجربہ تھی، علم کلیۃً عمل تھا، اور زندگی سراپا حرکت۔ ان موقعوں پر جنھوں نے مسائل و احکام سیکھے، وہ ان کے ذہن پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو گئے، امت کا بڑے سے بڑا فقیہ ان کے سمجھنے اور یاد رکھنے میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتا، ان کے ذریعہ سے ان مسائل نے عالم میں سب سے پہلے ظہور کیا، مسئلہ ان کے قویٰ کے ذریعہ عمل میں منتقل ہوا، اسی لیے بعض بعض صحابہ کسی کسی کے پوچھنے پر فرماتے تھے: "عَلَى يَدَيَّ دَارَ الْحَدِيثُ"(۱): "سارا قصہ میرے ہاتھوں ہوا ہے۔" تیمّم، غسل، نماز قصر، صلاۃ

(۱) رواہ مسلم، حدیث رقم ۲۹۶۷

الخوف اور کتنے مسائل ایسے ہیں جن کو انھوں نے اپنی اصلی حالت میں اور طبعی اوقات میں سیکھا اور پھر دنیا کو سکھایا۔

پھر سفر کتاب زندگی کا ایک مستقل باب ہے، اس کے علاحدہ عنوانات اور مستقل فصلیں ہیں، انسان کی زندگی کے بہت سے پہلو سفر کے علاوہ کبھی پیش نہیں آتے، وہ نئی ذمہ داریاں، نئے امتحانات کو لے کر آتا ہے، سفر میں بعض اوقات انسان کے اندر دوسرا انسان نظر آتا ہے، جو قیام وسکون کی ساری مدت میں نظر سے مخفی رہا۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے جو کسی دوست کی تعریف میں مبالغہ کر رہا تھا، فرمایا کہ کبھی تمہارا اس سے معاملہ پڑا ہے؟ کہا: نہیں، فرمایا: کبھی ساتھ سفر کیا ہے؟ کہا: نہیں، فرمایا: پھر تمھیں اس کی تعریف کرنے کا حق نہیں۔

حقوق وفرائض کی ادائیگی، ایثار، انصاف ودیانت، جذبات وامداد باہمی، جفاکشی، عالی حوصلگی، فراخ دلی، اللہ تعالیٰ سے دائمی تعلق، دینی استقامت یہ سب وہ صفات ہیں جن کی پوری تصدیق سفر ہی میں ہوسکتی ہے، جو اس کسوٹی پر پورا اترا وہ کھرا ہوتا ہے، جس کو پھر کوئی صرّاف رد نہیں کرسکتا۔ صحابہ کرامؓ نے اپنے معلموں اور داعیوں کو اسی کسوٹی پر پرکھا تھا، اور خود اسی کسوٹی پر پورے اتر کر انھوں نے دنیا کے بہترین معلم بننے کا استحقاق حاصل کیا تھا۔

مدینہ طیبہ کی شہری زندگی میں زندگی کے اصول وحقائق اس طرح کھلے ملے اور وہاں کی فضا اور ہوا میں اس طرح بسے ہوئے تھے کہ وہ جو کچھ محسوس کر رہے تھے، جو کچھ دیکھ رہے تھے، جو کچھ سن رہے تھے، وہ سب دین اور علم ہی تھا، کان سے جو کچھ سنتے تھے، آنکھ سے وہی دیکھتے تھے، دماغ جو کچھ سمجھتا تھا، دل اسی کی محبت محسوس کرتا تھا۔

صحابہ کرامؓ اور طلبۂ مدارس کے علم کا فرق

وہاں مخففات اور علامات کی تعلیم نہ تھی، بلکہ حقائق بالکل اپنی فطری اور طبعی حالت میں موجود تھے، دریا اور دریا کی تصویر، باغ اور باغ کے نقشے، پہاڑ اور پہاڑ کے لفظ میں جو فرق ہے، وہی فرق مدرسہ اور ان کی زندگی میں تھا، یہاں اشیاء کی علامات، اجسام کی تصویریں اور

معانی کے الفاظ ہیں، وہاں اصل اشیاء، حقیقی اجسام اور عین معانی تھے، ایک براعظم اور اس کے جغرافی نقشے میں جو فرق ہے، وہی ان کے علم اور مدرسہ کے طالب علم کے علم میں فرق ہے، جس طرح ایک براعظم کو کاغذ کے ایک صفحے پر دکھا دیا جاتا ہے، اسی طرح وسیع معانی کو جن کی وسعت بعض اوقات ایک براعظم سے بھی زیادہ ہوتی ہے، سہ حرفی اور چہار حرفی لفظ میں بند کر دیا جاتا ہے، جس طرح نقشے پر پہاڑوں کی صلابت، دریاؤں کی روانی اور میدانوں کی شادابی محسوس نہیں کی جاسکتی، اسی طرح ان معانی کی کیفیات اور ان کی لذتوں کا حروف سے ذائقہ نہیں چکھا جاسکتا۔

آج مدرسہ کا طالب علم اپنی تعلیم کے پہلے مرحلہ میں ایثار کا لفظ سیکھ لیتا ہے، اور معلم نے اس کا جو ترجمہ کسی دوسرے مفرد لفظ سے یا کسی جملے سے کیا ہے، اس کو یاد کر لیتا ہے، لیکن کیا وہ اس جذبے کی گہرائی اور اس کی وسعت کو سمجھتا ہے؟

صحابہ کرام نے ایثار کو اس کی عملی اور انتہائی مثالوں سے سمجھا تھا۔ حضرت ابوطلحہ انصاری (رضی اللہ عنہ) اپنے گھر رسول اللہ (ﷺ) کے مہمانوں کو لے کر آئے، دریافت کیا کہ مہمانوں کے لیے کچھ کھانے کو ہے؟ معلوم ہوا صرف بچوں کا کھانا رکھا ہے، فرمایا: اچھا! بچوں کو سلا دو اور چراغ گل کر دو، مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے تو خالی ہاتھ منہ تک لے آتے اور مہمانوں کو محسوس کراتے کہ وہ کھانے میں شریک ہیں، خود بھوکے اور مہمان سیر ہو کر اٹھے۔ یہ واقعہ صحابہ کرام کے علم میں آیا، رسول اللہ (ﷺ) نے تحسین فرمائی، قرآن مجید میں اس صفت کی تعریف آئی: ﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [سورة الحشر: ۹] ''انصاری اپنے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود ان کو تنگی ہو'' صحابہ کرامؓ نے ایک لفظ سیکھا اور ان کو معلوم ہوا کہ ''ایثار'' کسے کہتے ہیں۔

عبداللہ بن رواحہ (رضی اللہ عنہ) خیبر فصل کا غلہ لینے جاتے ہیں، یہودی ان کو رشوت دینا چاہتے ہیں، وہ انکار کرتے ہیں اور خود یہودیوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں، اور ایک حبہ زیادہ نہیں لیتے، یہودی پکار اٹھتے ہیں کہ یہی عدل ہے، جس پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ سننے والوں نے ایک نیا لفظ سیکھا اور ان کو معلوم ہوا کہ ''عدل و امانت'' کس کو کہتے ہیں۔

خبیب (رضی اللہ عنہ) پھانسی کے تختے پر ہیں، ایک شقی نیزہ مارتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ کیا تم اس پر تیار ہو کہ تمھاری جگہ محمد (علیہ السلام) ہوں اور تم بچ جاؤ؟ فرمایا: میں تو اس پر بھی تیار نہیں کہ ان کے تلوے میں کانٹا بھی چبھے اور میں بچ جاؤں۔ یہ واقعہ مدینہ منورہ پہنچا، صحابہ کرامؓ کے ذخیرۂ لغت میں اضافہ ہوا اور ان کو معلوم ہوا کہ "محبت" کسے کہتے ہیں۔

یہ چند مثالیں تھیں، اخلاقی اصطلاحات، لطیف معانی، دین کے مفردات سب انھوں نے اسی طرح سیکھے تھے۔ آج یہ الفاظ مدرسہ و مکتب کی چار دیواری میں نہایت ارزاں اور مقررین و مصنفین کی زبان و قلم پر بڑے ہلکے ہیں، ہماری زبان و ادب اور ہماری عملی زندگی میں وہ اپنی قیمت اور قوت کھو چکے ہیں، اس لیے کہ ان کے پیچھے عملی مثالیں اور مشاہدات نہیں ہیں، اور ہماری عملی زندگی ان کی کیفیات و حسیات سے خالی ہو چکی ہے۔

یہی حال اخلاقی اصولوں اور دینی تعلیمات کا تھا، ان سب تک وہ اپنے پاؤں چل کر پہنچے تھے، وہ ان راستوں کے نشیب و فراز اور سرد و گرم سے خوب واقف تھے، ان کی ایمانی صداقت مکہ کی گرم ریت اور جلتے ہوئے پتھروں پر آزمائی گئی تھی، ان کی امانت و عدالت کا بارہا سونے چاندی سے امتحان لیا گیا تھا، اور وہ ان سے زیادہ کھری نکلی تھی، ان کی محبت وطن و دیار اور خویش و اقارب کے تعلق سے بلند ہو چکی تھی، ان کا صبر فاقہ، غربت اور مظلومیت کے مرحلوں سے گزر چکا تھا۔ اسی تعلیم و تجربے کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی حکمت نظری نہ تھی بلکہ عملی تھی، وہ جتنے زبان کے بلیغ تھے، اس سے زیادہ عقل کے بلیغ تھے، ان کو اپنے علم کو صحیح محل پر صرف کرنے اور اپنی خداداد بصیرت سے وقت پر کام لینے کا ملکہ حاصل ہو گیا تھا، وہ واقعات و حقائق کو ٹھیک اسی حالت میں دیکھتے تھے اور ان کی اتنی ہی قیمت قائم کرتے تھے جو خالق فطرت نے قائم کر دی ہے۔

ان کا علم زیادہ پھیلا ہوا نہیں تھا لیکن گہرا اور پختہ تھا، ان کے پاس معلومات کی اتنی فراوانی اور جزئیات کی اتنی کثرت نہ تھی جو بعد کے لوگوں کے یہاں ملتی ہے، لیکن ان کو علم کا سرا ہاتھ آ گیا تھا، ان کے یہاں علمی موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں نہ تھیں لیکن ان کو علم کا مغز اور حقیقت کا لب لباب حاصل تھا، ان میں سپاہیوں کی سی سادگی، اہل تجربہ کی حقیقت پسندی

اور مشغول آدمیوں کا سا اختصار تھا، ان کی اہم تقریریں بھی جنھوں نے بڑے بڑے انقلابات برپا کردیے ہیں، حشو وزوائد سے پاک اور سراپا مغز ہیں، ان کے اقوال وکلمات اور ان کے خطبات ملاحظہ ہوں، سراسر متن ہیں، جن کی شرح میں ضخیم مجلدات لکھے جاسکتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے چند لفظوں میں ان کی تعریف کی ہے، اس تعریف میں وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو صحابہؓ کی سیرت کا امتیاز ہے، وہی بلاغت، وہی سادگی، وہی صداقت، وہی اختصار:

"أُولٰئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ (ﷺ)، كَانُوا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، أَبَرَّهَا قُلُوبًا، وَ أَعْمَقَهَا عِلْمًا، وَ أَقَلَّهَا تَكَلُّفًا."(۱)

''صحابہ اس امت میں سب سے افضل، سب سے زیادہ دل کے سچے، علم کے گہرے اور تکلفات سے دور تھے۔''

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان بادیہ نشینوں کو دنیا کی تنظیم جدید کے بالکل نئے کام سے سابقہ پڑا، جس کا ان کو پہلے قطعاً تجربہ نہ تھا، اور دنیا کی وہ متمدن سلطنتیں ان کی تولیت میں آئیں جہاں ہزاروں برس سے یونان وروما اور ایران کی حکمتوں، فلسفوں اور نظام سلطنت کے تجربات کا ذخیرہ جمع ہورہا تھا، اور جس زمین پر دنیا کے ذکی ترین حکماء، فلاسفہ، قانون ساز اور سیاسیین نے استعداد واجتہاد کے جوہر دکھائے تھے، تو انھوں نے ان کو اس طرح اپنے ضبط ونظم میں کرلیا جس طرح طاقتور چوپان بھیڑوں کے گلے کو اور معلم مکتب کے بچوں کو کرلیتا ہے، انھوں نے پرانی قبائے سلطنت کو ادھیڑ کر دوبارہ اس طرح سیا کہ اس میں کوئی جھول باقی نہیں رہا، انھوں نے ان گرتی ہوئی سلطنتوں کو سنبھال لیا اور ان میں نئی زندگی، روحانیت، اخلاقی احساس، بہتر تنظیم اور دینی شعور پیدا کردیا، انھوں نے ان کو صحیح مذہبیت، بہتر تہذیب، عادل سیاسی نظام، کارآمد تعلیم عطا کی، انھیں میں بغیر کسی دقت کے بہتر سے بہتر قاضی، خازن، محتسب، قائد اور مشیر مل گئے، جنھوں نے روم اور ایرام کی شہنشاہیوں کو فوراً

(۱) رواه رزين، كذا في مشكاة المصابيح للتبريزي، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب و السنة، حديث رقم ۱۹۳

سنبھال لیا، اور دیکھتے دیکھتے اپنے نئے سانچے میں ڈھال لیا، اور قرآن کا یہ کہنا ثابت ہو کر رہا کہ یہ سب اس امی کا فیض تھا جس نے اپنی تعلیم سے امیوں کو دنیا کا معلم اور ہادی بنا دیا، اور جہالت وضلالت کی پست سطح سے اٹھا کر دنیا کی رہنمائی کے منصب تک پہنچا دیا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الجمعة:۲]

نظامِ تعلیم وتربیت کی بنیاد ایمان ویقین پر ہونی چاہیے

حضرات! ہم نے پیغمبروں کے طریقۂ انقلاب واصلاح اور پیغمبرانہ تعلیم وتربیت کے بعض پہلوؤں کو دیکھا اور ان کے نتائج بھی ہمارے سامنے آئے، بات بے نتیجہ رہے گی اگر ہم چلتے چلتے اس پر غور نہ کریں کہ ہم اپنی موجودہ زندگی اور اصطلاحی مدرسہ میں اس سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں اور کن چیزوں کا ہم اپنے نظامِ تعلیم وتربیت یا شہری زندگی میں اضافہ کر کے اس کے بعض ایسے نقائص دور کر سکتے ہیں جو اب سب کو محسوس ہونے لگے ہیں اور سب کو تسلیم ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم وتربیت کی بنیاد ایمان ویقین اور دین پر ہونی چاہیے، اس کے بغیر ہمارا سارا نظام کھوکھلا، سطحی اور بے بنیاد رہے گا۔ پائیدار بنیاد اور صحیح محرکاتِ عمل اور جذبات دین کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے، اور صحیح محرکات وجذبات کے بغیر علم محض دماغی تعیش اور بے عملی وفلسفہ آرائی ہے، مغرب میں اس کا پورا تجربہ ہو چکا، جس پر مزید اضافے کی گنجائش نہیں۔ اگر ایک طالب علم کی متعدد زندگیاں اور جوانیاں ہماری تعلیم گاہوں کو تجربہ کرنے کے لیے ملتیں تو اس خطرناک وبے حاصل تجربے میں کسی حد تک مضائقہ نہ تھا، لیکن ایک طالب علم کے صرف ایک بچپن، ایک جوانی اور پورے سرمایۂ زندگی کو اور اس طرح قوم وملک کے بہترین سرمایہ کو تجربے کی بھٹی میں ڈالنا اور اپنے قیاسات اور آزمائشوں کا تختۂ مشق بنانا اس سے زیادہ خطرناک اور غیر ذمہ دارانہ فعل ہے جتنا بچوں کو سچے موتی اور جواہرات کھیلنے کے لیے دے دینا۔ قمار بازی ہر حالت میں قابلِ مذمت فعل ہے، لیکن انسانی

زندگیوں کے سرمایہ کو جوئے پر لگا دینا بالکل معاف کیے جانے کے قابل نہیں۔ ہزاروں برس کا تجربہ ثابت کر چکا ہے کہ فلسفہ اور علم، یقین اور سیرت و کردار کے پیدا کرنے سے بالکل قاصر ہیں، ان کے پیدا کرنے کے لیے انسانیت کی پوری تاریخ میں صرف ایمانی تربیت اور صاحب یقین اور صاحب درد اشخاص کی صحبت و معیت ہی ہے۔ دل، دماغ اور روح و جسم چاروں انسانیت کے ضروری شعبے ہیں، ان میں سے کسی کا حق کسی کو نہیں دیا جاسکتا، دل کا چھوٹے سے چھوٹا گوشہ دماغ کی بڑی سے بڑی مقدار سے پُر نہیں کیا جاسکتا۔ اس ناانصافی پر مزید اصرار اور واقعات کا انکار علم کی حقیقت پسندی کے شایان شان نہیں۔

شہری آبادی میں ایمان و یقین پیدا کرنے کی ضرورت

دوسری چیز یہ ہے کہ ہمیں اپنی شہری آبادیوں میں بھی ایمان و یقین اور طلب و احساس پیدا کرنے یا ان کو بڑھانے کا بنیادی کام کرنا چاہیے، ہمارے ''مدرسہ'' اور نظام تعلیم کی بنیاد دراصل اس اینٹ پر نہیں ہے جو کسی تعلیم گاہ کی بنیاد کے طور پر رکھی جاتی ہے، نہ مدرسہ کا استحکام ان سنگین دیواروں اور اونچے میناروں پر ہے جو کسی تعلیمی عمارت کی زیب و زینت ہیں، بلکہ عوام اور جمہور کے ایمان و یقین اور احساس و طلب پر ہے۔ جس درجہ یہ ایمان و یقین اور احساس و طلب طاقتور اور عام ہوں گے، اسی درجہ تعلیم گاہ غیر متزلزل اور نظام تعلیم مستحکم ہوگا، اور جس کثرت و عمومیت کے ساتھ یہ یقین اور تعلیمی احساس افراد جمہور میں پایا جائے گا اسی قدر تعلیمی دعوت موثر، تعلیمی جدوجہد نتیجہ خیز اور مدرسے کی اندرونی تعلیمی و تربیتی کوشش بارآور ہوگی، اور تعلیم گاہیں طالب علموں سے آباد ہوں گی۔

مدرسہ کے شاداب درخت کی جڑ مدرسہ کی زمین میں نہیں ہے، بلکہ مدرسے سے باہر قوم کے دلوں اور دماغوں میں ہے۔ یہ جڑ جب خشک ہو جاتی ہے تو اس کی شاخوں کو مصنوعی طور پر ہرا نہیں رکھا جاسکتا، اور مدرسہ کے اندر ان کو پانی دے کر درخت کو زیادہ دیر تک زندہ نہیں رکھا جاسکتا۔

اگر مدرسہ کے باہر یہ بنیادی کام نہیں کیا گیا تو اس کا ابتدائی نقصان تو یہ ہوگا کہ مدرسہ کو طالب علم ملنے مشکل ہو جائیں گے، اس لیے کہ طالب علم قوم کے جذبۂ طلب اور احساس و

ضرورت کا ایک قدرتی نتیجہ ہیں، جس طرح کسی درخت کا پھل اس کے صحیح نمو اور اس کی زندگی کی علامت ہے، اسی طرح طالب علم قوم کے احساس فرض اور جذبۂ تکمیل کا طبعی ثمر ہیں۔ اگر کسی قوم کو تعلیم و تربیت کی ضرورت کا صحیح احساس نہیں اور علم کی کمی یا فقدان پر اس کو اپنی زندگی میں کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا تو وہ زیادہ دنوں تک یہ ایثار نہیں کر سکے گی کہ اپنے فرزندوں کو اپنی گود سے نکال کر مدرسہ کی آغوش میں ڈال دے اور اپنی آنکھوں سے اوجھل کردے۔ اگر اس کا ذہن تربیت یافتہ اور اس کی نگاہ دور بیں نہیں ہے تو وہ نقد کو (خواہ وہ کتنا کم ہو) قرض پر (خواہ وہ کتنا زیادہ ہو)، حال کو (خواہ وہ کتنا حقیر ہو) مستقبل پر (خواہ وہ کتنا شاندار ہو) قربان نہیں کر سکے گی، اور تعلیم گاہوں کا سارا معاملہ قرض ہی پر ہے۔

عوام میں علم کی ضرورت کا احساس وشوق اور ایمان ویقین پیدا کرنے کے کام سے غفلت کرنے کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ مدرسہ سے باہر کی فضا مدرسہ سے سازگار اور موافق نہیں ہوگی اور مدرسہ سے پڑھ کر نکلنے والے یا تو اپنے بگڑے ہوئے ماحول میں گم ہوجائیں گے، (اگر ان میں انفعال اور احساس کمتری ہے) اور عوام کے ہمرنگ ہوکر اپنے معلمین اور مدارس کی ان تمام کوششوں پر پانی پھیر دیں گے جو ان کی تربیت وتکمیل کے لیے کی گئی تھیں، یا (اگر ان میں احساس برتری ہے) اپنا امتیاز قائم کر کے قومی زندگی میں ایک ناہمواری، ناخوش گوار کشمکش اور تلخی پیدا کریں گے، یہ اپنے کو ایک برتر وجود اور غیر تعلیم یافتہ وناخواندہ انسانوں کو حقیر وذلیل سمجھیں گے اور ہر چیز میں ان سے ممتاز رہنے کی کوشش کریں گے، اس طرح زندگی کے سمندر میں سیکڑوں ہزاروں چھوٹے چھوٹے حقیر جزیرے جو شاید خورد بین کی مدد کے بغیر نہ دیکھے جاسکیں، قائم ہوجائیں گے اور زندگی میں نئی مشکلات اور نئے امتیازات پیدا ہوجائیں گے۔ اس لیے جمہور کو ایک ایسی دینی وذہنی اور اخلاقی سطح تک لے آنا جہاں سے ان کو تعلیم کی ضرورت کا احساس، اس کی صحیح طلب، پھر تعلیم یافتہ لوگوں سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت اور ان کو کارآمد عنصر سمجھنے اور ان کو زندگی میں قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے، ہر اس نظام تعلیم کا فریضہ ہے جو عملی زندگی اور خارجی دنیا سے اپنا ربط قائم رکھنا چاہتا ہے۔

ہمیں اس کا بھی یقین رکھنا چاہیے کہ ہم سب افراد جمہور کو ''مدرسہ'' کی دعوت نہیں دے سکتے، خواہشات وواقعات میں بڑا فرق ہے، ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ جمہور کا ایک بڑا طبقہ ''مدرسہ'' کی باضابطہ تعلیم سے محروم رہے گا۔ ان بالغین کے لیے جو اپنے ضروری مشاغل زندگی اور وسائل معاش میں منہمک ہیں، اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ ان میں دین کی بنیاد پر یہ احساس وذہنیت پیدا کردی جائے کہ وہ علم کو بھی اپنی زندگی کا ضروری کام سمجھ کر اپنے مشاغل کے ساتھ اس کی فکر کریں، اس کے لیے وقت نکالیں، عارضی طور پر اپنے ماحول سے باہر نکلیں، ایک دوسرے سے مل جل کر اور ساتھ رہ کر نیز مطالعہ وگفتگو کے ذریعہ اپنی زندگی کے اس ضروری شعبے کی تکمیل کریں۔ اس کے لیے ہمیں اپنی تعلیم کے تصور اور تعلیم کے وسائل میں وسعت پیدا کرنی ہوگی، اور بعض اوقات اس دور کی طرف بازگشت کرنی پڑے گی جب تعلیم زیادہ آزاد، زیادہ فطری اور زیادہ نتیجہ خیز تھی۔

تعلیم وتعلم ایک مستقل اور اعلیٰ عبادت ہے

تیسری چیز یہ ہے کہ علم کی عظمت اور تعلیم کے ایک مستقل اور اس کے عبادت ہونے کا تصور پھر پیدا کیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ طالب علم کا ذہنی مرکز درست ہوجائے، اور وہ علم کو ''پیٹ بھرنے کا ایک ذریعہ'' سمجھنے کے بجائے ۔جس نے اس کو اس قدر ذلیل اور پست کردیا ہے اور سارے نظام تعلیم کو بے روح اور بے سوز اور ساری دنیا کو نیلام کی ایک منڈی بنا رکھا ہے، جہاں علم اور صاحب علم کوڑیوں کے مول بکتے ہیں، اور جہاں ذرا سے دام بڑھا کر ہر طرح کا جوہر ادراک خریدا جاسکتا ہے۔علم کو خدا کی معرفت، اس کی رضا کے حصول اور عمل کا ایک ذریعہ سمجھنے لگے، علم کی قیمت کو طالب علم کی نگاہ میں اتنا بڑھا دیا جائے کہ اس کو نبوت کے سوا اپنے مقام سے اونچا کوئی مقام اور خدا کے سوا اپنا کوئی خریدار نظر نہ آئے، اس کی تعلیم گاہ کا ماحول، اس کا نصاب تعلیم اور اس کے معلمین اس پر علم کا صحیح مقصد اور اس کا بلند مقام واضح کرتے ہوں، اور مدرسہ کے ہر طالب علم کے دل میں یہ حقیقت اتار دیتے ہوں کہ ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

دینی مدارس کا ایک خلا

ایک عرصے سے ہماری دینی درسگاہیں بھی روح سے خالی ہوتی جارہی ہیں، علم کا مقصد اور مقام اور اس کے دینی فضائل مدرسہ کے تعلیمی ماحول میں بہت غیر اہم بن گئے ہیں، اور فضائل علم کا یہ حصہ جس میں سیکڑوں بجلیوں کی طاقت اور سیرت سازی اور ولولہ انگیزی کی بہترین قوت ودیعت ہے، ہمارے مدارس کے نصاب و نظام تعلیم سے عملاً خارج ہے۔ جس مرحلے پر یہ چیزیں طلبہ کے سامنے آتی ہیں وہ بہت بعد کا مرحلہ ہے، اور وہ بھی نہایت تیز رفتاری، رواداری اور بے توجہی سے گزر جاتا ہے۔ جس مرحلے پر طالب علم کو ان فضائل و محرکات کی ضرورت ہے، وہ مسائل وتفصیلات میں گزر جاتا ہے۔ تعلیم کے آخری یا درمیانی مرحلے پر حدیث کی کتابوں میں یہ فضائل آتے ہیں، لیکن حدیث کی تعلیم اور اسباق کا سب سے کم اہم اور ناقابل توجہ حصہ یہی ہے، جس کی طرف نہ تو معلم کی توجہ ہوتی ہے نہ طالب علم کی۔ معلم اپنی ساری ذہانت اور متعلم اپنی پوری محنت اختلافی مسائل اور علمی مباحث میں صرف کردیتا ہے، اور فضائل وترغیبات کی طرف توجہ ایک واعظانہ اور عامیانہ کام سمجھا جاتا ہے۔

ایمان واحتساب اور اخلاص کی ضرورت

ضرورت ہے کہ ہر دینی مدرسہ کے تعلیمی سال کے آغاز میں اور ہر جماعت میں ان فضائل کا بار بار تذکرہ ہو، اور اخلاص وتصحیح نیت پر زور دیا جائے، اور طالب علم کو اپنے مقصد کے معین کرنے اور ایمان واحتساب (خدا کے وعدوں پر یقین اور ان وعدوں کو پیش نظر رکھ کر کام کرنے) کی تاکید کی جائے۔ اس سے طلبہ میں علم ودین کی وہ کیفیات اور وہ جذبات پیدا

ہوں گے جن سے ہماری مذہبی درسگاہوں کی فضا اور ہماری مذہبی زندگی روز بروز خالی ہوتی جارہی ہے، اوراسی کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ ہمارے دینی علوم بھی اسی طرح روحانیت سے خالی اور ہمارے دینی فضلاء بھی جذبہ سے عاری ہوجائیں گے جس طرح غیر دینی علوم او رغیر دینی درسگاہوں کے فاضل نظر آتے ہیں۔

اس کے لیے اہل مدارس کو وہ تمام وسائل اختیار کرنے چاہئیں جو مفید و مؤثر ثابت ہوں، سال کے شروع میں اس موضوع پر تقریروں کا انتظام، معلمین کا اپنے اسباق میں اس کا خصوصی اہتمام، چھوٹے چھوٹے مؤثر رسالوں کی اشاعت اور نصاب تعلیم کے ابتدائی مرحلہ میں ایسی کتابوں کی شمولیت جن میں خاص طور پر اس کی طرف توجہ کی گئی ہو۔ (۱)

---

(۱) ماخوذ از ماہنامہ ''الفرقان''، لکھنؤ (شمارہ جمادی الاخری ۱۳۶۸ھ)۔

دینی وعربی مدارس کی خصوصیات

اور

ہندوستان کی تاریخ اور ثقافت میں ان کا حصہ

فضلائے مدارس عربیہ کی چند امتیازی خصوصیات

قدیم دینی نظام تعلیم اور عام طور پر جو دینی یا عربی مدارس کہلاتے ہیں، وہ بعض ایسی خصوصیات کے مالک اور محافظ ہیں جو جدید تعلیمی نظاموں (Educational Systems) میں (ان کی افادیت اور ضرورت کا انکار کیے بغیر) مفقود یا بہت نایاب ہیں، اوران کی بنا پر ہر بدلے ہوئے زمانے اور ترقی یافتہ جدید دور اور ایک نوخیز وترقی پذیر معاشرہ میں ان کی قدر قیمت اور ضرورت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں بہت اختصار کے ساتھ چند خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کی عملی مثالیں اور واقعات ہندوستان کی علمی ودینی تاریخ کے ہزارہا صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔

۱- ان میں سے ایک بڑا امتیاز وشعار (خصوصیت وعلامت) پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کا اخلاص (Sincerity) اور ایثار (Sacrifice) ہے۔ چونکہ تعلیم وتعلم کا اُخروی ثواب اور استاد ومعلم کی دینی فضیلت طلبہ کے ذہن پر نقش ہوتی ہے، اوران کا عقیدہ اور جزو ایمان بن چکی ہوتی ہے، اس لیے ان میں (اگر سب نہیں تو ایک بڑی تعداد) محض خدا

کی خوشنودی اور اجر وثواب کے حاصل کرنے کے لیے تعلیم و تعلم میں مشغول ہوتی ہے، اور اس کو افضل عبادت و اعلیٰ سعادت سمجھتی ہے۔ اساتذہ میں بہت سے حضرات زہد و قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے علمی امتیاز اور کمال فن کی بنا پر اپنے ملک یا دوسرے ملکوں میں جو فوائد و مواقع حاصل کر سکتے ہیں، ان سے آنکھ بند کر کے اپنے ملک اور مدرسہ میں قناعت و ایثار کی زندگی گزارتے ہیں، اور اپنے فن اور طلبہ کی خدمت کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں بھی اقتصادیات اور معیار زندگی کتنی ہی اہمیت حاصل کر لے، اس ایثار و قربانی اور قناعت کی تحقیر، اور اس کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ (۱)

۲-دوسری خصوصیت درس میں انہماک ہے۔ مدارس عربیہ کے اساتذہ کو درس و تدریس میں اس درجہ استغراق و انہماک رہا کرتا تھا (اور اس کا نمونہ اب بھی دیکھا جا سکتا ہے) جس کا تصور بھی واقعات اور مثالوں کے بغیر مشکل ہے، اور ان کا اس مختصر مضمون میں پیش کرنا اور بھی دشوار تر ہے۔ پڑھنا اور پڑھانا، مطالعہ اور محنت ان کی روح کی غذا اور ان کی عبادت اور وظیفہ بن گیا تھا۔ اساتذہ کے تمام اوقات (بشری ضرورتوں اور قلیل راحت کے علاوہ) پڑھنے پڑھانے میں گھرے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض حضرات کھانے کے وقت اور چلتے پھرتے بھی پڑھاتے تھے۔

۳-تیسری خصوصیت طلبہ سے تعلق ہے۔ ان اساتذہ کو اپنے شاگردوں اور طالب علموں سے ایسا گہرا اور شدید تعلق ہوتا تھا (۲) جس کی مثال اس زمانہ اور جدید نظام تعلیم میں ملنی مشکل ہے۔ اساتذہ طلبہ کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے، اکثر اوقات ان کے متکفل ہوتے تھے، اور ان کو خورد و نوش میں شریک کرتے تھے۔ (۳)

۴-اسی طرح طلبہ کا اساتذہ سے ایسا تعلق تھا جس کے سلسلے میں تاریخ و سوانح حیات

(۱) اس ایثار و قناعت بلکہ قربانی کے چند واقعات اور مثالوں کے لیے مصنف کی کتاب ''ہندوستانی مسلمان'' (تاریخی جائزہ) ملاحظہ ہو، ص ۱۱۸-۱۲۰، مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

(۲) اور اب بھی مدارس عربیہ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

(۳) اس کی عملی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۱۲۲-۱۲۳۔

میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن کا یقین کرنا اس زمانے میں مشکل ہے، اور جن کی نقل وتقلید بھی اس زمانے میں دینی وعلمی حیثیت سے نہ ضروری ہے نہ ممکن،[(۱)] پھر بھی خالص مادی اور لادینی (Secular) تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں اب بھی مدارس دینیہ عربیہ کو اس سلسلے میں کھلا امتیاز حاصل ہے۔

۵- ان دینی اور عربی مدارس کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان کے فضلاء اور سند یافتہ لوگوں نے اپنے وقت کے غلط رجحان، کسی خطرناک فتنہ، یہاں تک کہ سلطنتوں (اور وہ عام طور پر مسلم سلطنتیں ہوتی تھیں) کی غلط سیاست اور ناجائز قوانین اور سرپرستیوں کا دلیرانہ اور بعض اوقات سرفروشانہ مقابلہ کیا، اور بعض اوقات اس میں جانیں دے دیں، اور بعض اوقات سلطنتوں اور ملک ومعاشرہ کا رخ بدل دیا، اور کسی قیمت پر بھی وہ حکومت کے ہاتھوں یا اہل دولت اور اہل اثر کے ہاتھوں بکے نہیں۔[(۲)]

۶- اس تعلیم وتربیت، حق پسندی، اخلاقی جرأت اور ضمیر کی آزادی وبیداری کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے مقابلے کی پہلی صدا اسی دینی طبقہ اور علماء کے حلقے سے بلند ہوئی، اس نے سب سے پہلے اس خطرے کو محسوس کیا، اور انگریزی اقتدار کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔[(۳)]

انگریز مؤرخین نے صاف طور پر اس کا اظہار کیا ہے کہ "۵۷ء کی جنگ آزادی میں (جس کو وہ غدر Mutiny کے لقب سے یاد کرتے ہیں) سید احمد صاحبؒ کی جماعت

(۱) ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۱۲۳-۱۲۴

(۲) اس کی دو روشن تر مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ چہارم و حصہ پنجم اور اس کا انگریزی ترجمہ Saviours of Islamic Spirit Vol.III & IV

(۳) ملاحظہ ہو حضرت سید احمد شہیدؒ (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء) کا خط مہاراجہ گوالیار اور ان کے افسر افواج کے نام، جس میں انھوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف متحدہ جنگ اور صف آرائی کی دعوت دی ہے۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ، جلد اول، ص ۳۰۴-۳۰۴۔)

انھوں نے نواب امیر خاں (بعد میں والی ریاست ٹونک) کی رفاقت ترک کر دی، جب انھوں نے انگریزوں سے مصالحت کر لی۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ، جلد اول، ص: ۱۴۶-۱۴۷۔

مجاہدین کی چنگاریاں ہی کام کررہی تھیں۔ اسی بنا پر اس جنگ آزادی میں سب سے بڑی قربانیاں اسی جماعت کے افراد و خاندانوں، بالخصوص خاندان صادق پور (پٹنہ) نے دیں، ان کی جائدادیں ضبط ہوئیں، مکانات یہاں تک کہ مقابر تک منہدم کیے گئے، اور بعض نامی گرامی افراد (مولانا یحیٰی علی صاحب، مولانا احمد اللہ صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب) جزیرۂ انڈمان اور کالا پانی بھیج دیے گئے اور وہیں اول الذکر دونوں افراد کی وفات ہوئی۔ [1]

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں ہندوستان کی آزادی کا صور پھونکا گیا اور آزادی کی تحریک اور تحریک خلافت وجود میں آئی تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ قربانیاں طبقۂ علماء کے افراد اور فضلائے مدارس نے دیں۔ مولانا محمود حسن دیوبندی (جو شیخ الہند کے لقب سے معروف ہیں) اور ان کے ساتھ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولانا عزیر گل صاحب، مولوی وحید احمد اور حکیم نصرت حسین کوڑوی کو ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ (۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء) کو پہلے مصر پھر مالٹا بھیج دیا گیا، جہاں وہ تین سال دو مہینے رہے، اور حکیم نصرت حسین صاحب کا وہیں انتقال ہوا، واپسی پر بھی وہ آخر وقت تک آزادی کی جدوجہد اور اس تحریک و دعوت میں نہ صرف شریک بلکہ پیش پیش رہے۔ جہاں تک مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کا تعلق ہے، وہ اتنے بار جیل گئے کہ کسی سیاسی قائد کو اس کا اتفاق کم ہی ہوا ہوگا۔

اس تحریک آزادی میں حضرت شیخ الہند اور ان کے اہل عقیدت و ارادت کے علاوہ کثیر التعداد علماء اور فضلائے مدارس شریک تھے، جن میں مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سہاروی، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا عبدالحلیم صدیقی، اور کثیر التعداد

---

(۱) ملاحظہ ہو کتاب ''کالا پانی''، از مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری۔ ان حضرات کے علاوہ مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی، اور مفتی مظہر کریم صاحب دریابادی کو بھی انڈمان میں جلاوطنی کی سزادی گئی، اور یہ سب تعلیمی حلقہ اور مدارس کے لوگ تھے۔ ملاحظہ ہو تذکرۂ صادقہ (تالیف مولانا عبدالرحیم صاحب صادقپوری، و مقدمہ از مولانا ابوالکلام آزاد)۔

علماء اس گروہ میں شامل ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد معروفِ عوام وخواص ہیں، اور وہ نہ صرف جنگ آزادی کے ایک قائد و رہنما، بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کے اعلیٰ دماغ اور مفکر اعظم ہیں۔ ان کے علاوہ بھی عام طور پر فضلائے مدارس، علمائے دین، یہاں تک کہ خالص علمی و تحقیقی کام کرنے والے حضرات بھی تحریک آزادی وطن سے ہمدردی اور دلچسپی رکھنے والے اور فکری طور پر ان سے ہم آہنگ تھے، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی (ناظم دارالمصنفین) مولانا معین الدین اجمیری اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بہاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور ہندوستان کی تاریخ آزادی کا کوئی مؤرخ ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ان فضلاء وطلبائے مدارس عربیہ کی ایک خصوصیت (جس کو اس صدی کے اخلاقی طور پر بر سر انحطاط معاشرے اور بے اصولی کے دور میں بے قیمت اور حقیر نہیں سمجھا جاسکتا) ان کے ان اخلاقی اصول، دینی تعلیمات اور تہذیب وآداب کی پابندی ہے، جو وہ قرآن وحدیث، سیرت نبوی اور علمائے سلف کے تذکروں سے سیکھتے، اپنے اساتذہ میں اس کا نمونہ دیکھتے اور ان سے اس کی تاکید وتعلیم پاتے ہیں، اور جس کی اس بگڑے ہوئے (Corrupt) معاشرے میں بڑی ضرورت ہے، اور جس کو کردار سازی (Character Building) سے تعبیر کرتے ہیں، جس کی ہمارے معاشرے میں عام طور پر اور جدید دانش گاہوں میں خاص طور پر کمی نظر آتی ہے۔

مشہور وممتاز ترین دینی وعلمی درسگاہیں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی پر ملک میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں تیزی کے ساتھ احساس شکست، احساس کہتری اور ایک عام مایوسی پھیلتی جارہی تھی۔ نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ پورے ملک میں جدید مغربی نظام تعلیم اور فلسفۂ زندگی وتمدن کا اثر بلکہ سحر پھیلتا جارہا تھا، اور اس سے اخلاق ومعاشرت میں ایک انتشار اور سیاسی غلامی کے ساتھ ذہنی غلامی پیدا ہورہی تھی، جس کا اثر اخلاق ومعاشرت پر بھی پوری قوت کے ساتھ ظاہر

ہورہا تھا، [۱] اور آسانی سے یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اگر یہی صورت حال باقی رہی تو ہندوستان کی آبادی بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ (جس کے ہاتھ میں زمام قیادت اور عنان فکر رہتی ہے) اس مغربی قارورہ میں تحلیل ہوکر رہ جائے گا۔

اس تاثر کا مقابلہ کرنے کے لیے یونیورسٹیاں کافی نہیں تھیں، جو مغربی نظام تعلیم ہی کی مقلد، خوشہ چیں بلکہ پیرو تھیں۔

اس صورت حال کے مقابلہ میں جری اور دور بیں علماء نے ایسے دینی مدارس کا قیام ضروری سمجھا جو سیاسی زوال کے بعد (کم از کم) مسلمانوں کو دینی و اخلاقی زوال سے محفوظ رکھیں، اور ان میں داعیانہ روح اور رضا کارانہ خدمت اور اشاعت علم کا جذبہ ہو، اور جو حکومت کی اعانت وسرپرستی کے بغیر اس ملک میں مسلمانوں کی دینی خدمت اور رہنمائی اور علم کی اشاعت وحفاظت کا فرض انجام دے سکیں۔

دارالعلوم دیوبند اور دوسرے مرکزی دینی مدارس

ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کو اولیت اور خاص اہمیت حاصل ہے، دارالعلوم دیوبند سے اس کی سوسالہ تاریخ میں تحصیل علم کر کے نکلنے والوں کی تعداد دس ہزار سے بھی زیادہ ہے، فارغین میں افغانستان، یاغستان، خیوہ، بخارا، قازان، روس، آذربائیجان، مغرب اقصی، ایشیائے کوچک، تبت، چین، جزائر بحرالہند وغیرہ دوسرے ملکوں کے طلبہ شامل ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کی دینی زندگی پر دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی اصلاحی کوششوں کے نمایاں اثرات رونما ہوئے، متعدد فضلاء نے سیاسی میدان اور وطن عزیز کے دفاع کے سلسلے میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے، اور حق گوئی وبے باکی میں علمائے سلف کی یاد تازہ کردی۔

(۱) اس کا مقابلہ سب سے زیادہ مشہور و نامور شاعر لسان العصر سید اکبر حسین الہ آبادی اکبر نے کیا، جو مغربی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور پورے مشرق میں اس پر سب سے بڑے صاحب نظر اور طنز نگار تھے۔ مصر میں بھی ان کا تعارف (راقم کے قلم سے) اور ان کے کلام کے ترجمہ پر ایک کتاب "الحضارة الغربية الوافدة و أثرها في الجيل المثقف" کے نام سے دارالصحوة، القاهرة کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے بعد سہارنپور کے مدرسہ مظاہر علوم کا نمبر ہے، یہاں سے بھی بڑی تعداد میں علماء اور علم دین کے مخلص وخدمت گزار فارغ ہوکر نکلے ہیں، جنھوں نے خاص طور پر فن حدیث کی بڑی خدمت کی ہے، متعدد کتب حدیث کی شرحیں ان کے قلم سے نکلی ہیں، جن کی وجہ سے ممالک عربیہ میں بھی اس کی شہرت ہوئی ہے، اور وہاں کے ماہرین فن بھی ان کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ (۱)

ہندوستان میں درس نظامی کے دوسرے مدارس بھی ہیں جن میں قدیم نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، جماعت اہل حدیث کے بھی متعدد مدارس ہیں، جو حدیث وسنت کی تدریس وتحقیق کا کام کرتے ہیں، فرقہ اثنا عشری (شیعہ فرقہ) کے بھی مدارس ہیں، جن میں لکھنؤ کے بعض مدارس (سلطان المدارس، ناظمیہ ومدرسۃ الواعظین) ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، جنوبی ہند میں بھی کثیر التعداد وسیع وعظیم درسگاہیں ہیں، یوپی، بہار، گجرات، دکن (خاص طور پر حیدرآباد) کرناٹک، اور مالابار، کیرالہ میں متعدد شاندار مدارس اور دینی وعلمی ادارے ہیں۔ (۲)

دارالعلوم ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کی فکری تحریک ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں وجود میں آئی۔ اس کے بانی مولانا سید محمد علی مونگیریؒ تھے، (۳) اس کی رہنمائی ان کے بعد عرصہ تک علامہ شبلیؒ، ان کے

---

(۱) ان میں خاص طور پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) قابل ذکر ہیں، جن کی شروح حدیث اور علمی رسائل مصر، شام وحجاز میں بڑی وقعت اور عقیدت سے پڑھے جاتے ہیں، اور ان کا بلند الفاظ میں اعتراف کیا جاتا ہے۔

(۲) اس کے لیے ان مدارس عربیہ کی مکمل فہرست پیش کرنی مشکل ہے، بطور نمونہ ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب ''ہندوستانی مسلمان'' ص ۱۳۴-۱۳۶

(۳) مولانا کے حالات وسوانح کے لیے ملاحظہ ہو ''تذکرہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ'' از سید محمد الحسنیؒ، (شائع کردہ ندوۃ العلماء)۔ منصب نظامت کے ذمہ داروں میں ہندوستان کے نامور مصنف، مؤرخ و ادیب اور عربی میں ہندوستان کی تاریخ اور شخصیات کے سب سے بڑے مؤرخ اور سوانح نگار مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ اور ان کے فرزند گرامی قدر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کا ذکر کافی ہوگا جو ایک طرف علمائے راسخین میں تھے، دوسری طرف علوم جدیدہ کے ماہرین اور ممتاز فضلاء میں تھے۔

نامور رفقاء وتلامذہ خاص طور پر علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ہندوستان کے ممتاز علماء اور اہل فکر نے کی جو نظامت اور معتمدی کے منصب پر فائز رہے۔ [1]

اس تحریک کی بنیاد اس نظریہ اور اصول پر تھی کہ نصاب تعلیم ایک تغیر و ترقی پذیر ذریعۂ تعلیم و تربیت ہے، جس کو زمانہ کی تبدیلیوں اور تقاضوں کے مطابق (دینی روح و مقاصد، بنیادی عقائد اور اساسی علوم کی حفاظت کے ساتھ) بدلتے اور ترقی کرتے رہنا چاہیے، وہ ان کے نزدیک ایک جامد، متحجر (Fossilized) نصاب ہونے کے بجائے ایک زندہ اور نامی جسم کی طرح زندگی، ترقی اور وسعت کی صلاحیتوں سے بھرپور ہے۔ دوسرے الفاظ میں دین ایک ابدی حقیقت ہے، جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں، لیکن علم ایک پھلنے پھولنے والا درخت ہے جس کا نشو و نما برابر جاری رہے گا۔ اسلام ان کے نزدیک ایک عالمگیر اور جاوداں دین اور زندگی ہے، اس لیے ذہن انسانی کے ارتقاء و تنزل اور تغیرات کی مختلف منزلوں سے اس کا سابقہ پڑنا اور ان بدلے ہوئے حالات و تصورات و افکار میں رہنمائی کا فرض انجام دینا اور پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو رفع کرنا ایک قدرتی امر ہے۔ اس کے لیے اس ذریعۂ تعلیم کی بھی (جو اسلام کے نمائندوں اور اس کے شارحین کو تیار کرتا ہے) اپنے دائرہ کو برابر وسیع کرتے رہنے اور اپنی صلاحیت و زندگی کا ثبوت دیتے رہنے کی ضرورت ہے۔

اس احساس اور حقیقت بینی کی بنا پر ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور رہنماؤں نے ان یونانی علوم (منطق و فلسفہ) کے اس حصہ کو کم اور بقدر ضرورت رکھا اور اس علم کلام میں بھی حذف و اضافہ سے کام لیا، جو درحقیقت یونان کے ان مفروضات اور تعلیمات کی تردید پر مبنی تھا، جو علمی حقائق کے بجائے یونان کی دیومالا (Greek Mythology) پر مبنی تھا۔ اس کے بجائے جدید علوم میں سے جغرافیہ، تاریخ، ریاضی اور جدید کتابوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے انگریزی کی محدود تعلیم داخل نصاب کی، محض کتب تفسیر پر اکتفا کرنے کے بجائے متن قرآن کو داخل نصاب کیا۔

ایک بڑا انقلابی قدم یہ اٹھایا کہ عربی زبان کو (جس کی قدیم نصاب میں نمائندہ اور ذریعۂ تعلیم نثر و نظم کے چند مجموعے تھے، جو تصنع و تکلفات سے مملوء اور محض مشکل الفاظ کے

(۱) تفصیل کے لیے [illegible] ''[illegible] ندوۃ العلماء'' [illegible] شائع کردہ دفتر نظامت ندوۃ العلماء، لکھنؤ

سمجھنے اور یاد کرنے کا ایک ذریعہ تھے) ایک زندہ و رواں، تقریر و تحریر اور دعوت و تاثیر کی قابلیت پیدا کرنے والی زبان کی طرح تعلیم دینے کا انتظام کیا، جس سے وہ افراد تیار ہو سکیں جو خود اہل زبان کو متاثر کرنے اور عالم عربی کے (عصر جدید اور مغربی اقتدار سے پیدا ہونے والے فتنوں اور تحریکات) کا مقابلہ کرنے اور دین حنیف کی دعوت دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ چنانچہ اس کے متعدد فضلاء نے قومیت عربیہ کی زبردست تحریک - جس کے بانی عیسائی عرب تھے، اور جس کا مقصد عربوں کو جاہلیت اولیٰ کی طرف واپس لانا تھا، جس میں کفر و ایمان، اسلام و عیسائیت کا کوئی فرق نہیں تھا، اور جس کی طاقتور داعی "البعث العربي" کی تحریک، اور جس کے بڑے حامی و سرپرست ماضی قریب میں صدر جمہوریہ مصر جمال عبدالناصر، انور السادات اور شام کی بعث پارٹی تھی - کا طاقتور اور نہایت مؤثر مقابلہ کیا، جس کا اعتراف اسلامی الفکر عرب فضلاء اور قائدین نے کیا۔ (۱)

ندوۃ العلماء کی تحریک کے رہنماؤں اور اس درسگاہ کے متعدد فضلاء نے اسلامی ثقافت کی نشر و اشاعت، سیرت نبوی کی تحریر و تدوین، اسلام کے کارناموں اور اس کی تعلیمات کو جدید علمی اور ادبی اسلوب میں پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کی علمی و ادبی تحریرات، اسی طرح ان کے شاگرد رشید و جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خدمات اور ان کے علمی کارناموں سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مؤقر اور عالمی شہرت رکھنے والے ادارہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام (دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ اور اہل فکر کو متاثر کرنے والا ایسا اسلامی لٹریچر تیار کیا جس کی مثال خالص اسلامی اور عرب ملکوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔ (۲)

---

(۱) اس کا نمونہ جواں سال ادیب و انشاء پرداز سید محمد الحسنی مرحوم کی تحریریں اور "البعث الإسلامي" اور "الرائد" کے پرچے ہیں، جن کے مضامین سے خود قومیت عربیہ کے داعی مضطرب اور پریشان ہوئے، اور صاحب حمیت و انصاف عرب فضلاء نے ان کی طاقت و بلاغت کا اعتراف کیا۔

(۲) مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی متعدد کتابوں کا ترجمہ ترکی، فارسی، انڈونیشی، فرنچ، جرمن، روسی اور اب حال میں اسپینی زبان میں بھی شروع ہو گئے، اس کی بعض کتابوں کے (جس کے اردو میں چار پانچ ایڈیشن نکلے ہوں گے) عرب ملکوں میں ۱۵-۱۵ اور ۲۰-۲۰ ایڈیشن نکلے

اس کے نصاب کے لیے تیار کی ہوئی بعض کتابیں خالص عرب ملکوں کے اسکولوں، کالجوں اور بعض یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہیں، جو نہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء، یہاں کے مدارس عربیہ بلکہ ہندوستان کے لیے ایک فخر کی بات ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ان خصوصیات اور کارگزاریوں سے خود ہندوستان کا عالم اسلامی اور ممالک عربیہ میں اچھا تعارف ہوا، اس کے کارناموں کا اعتراف کیا گیا، اور اس کے فضلاء کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم (ڈاکٹر سر محمد اقبال) نے اپنی بالغ نظری سے اس حقیقت کو دیکھا اور اس کا اعتراف کیا، وہ لکھتے ہیں:

> ''میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں، کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی نگاہوں میں ندوہ علی گڑھ سے زیادہ کامیاب ثابت ہو''(۱)

خود ممتاز ترین فضلائے عرب نے بھی وقتاً فوقتاً اس کے امتیاز کا اعتراف کیا۔ یہاں پر چند تأثرات و بیانات درج کیے جاتے ہیں:

علامہ عبدالعزیز تیونسی جو اپنے ملک کے بڑے سیاسی رہنما، عربی کے بڑے فاضل و ادیب تھے ۱۹۲۳ء میں ہندوستان آئے تو انھوں نے دارالعلوم میں اپنی تقریر میں کہا:

''حضرات! عالم اسلامی میں ہندوستانی مسلمانوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے، اگر آپ اپنی تنظیم کرلیں تو تمام عالم اسلامی کی بہبودی اور ترقی کا مرکز آپ بن سکتے ہیں، پھر آپ اپنی طاقت سے ایک بار دنیا کا نقشہ پلٹ سکتے ہیں۔''(۲)

عالمی شہرت اور اہمیت کے مالک شیخ الازہر الاستاذ الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے بھی اس کا اعتراف و اظہار اپنے اس خطبۂ صدارت میں کیا جو ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن

---

(۱) اقبال نامہ، ص ۱۶۸، کتاب موسوم ''اقبال سید سلیمان ندویؒ کی نظر میں'' میں ''اسلامی ہند'' کے بجائے ''اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں'' کے لفظ آئے ہیں۔ ص ۱۸۸

(۲) تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ دوم، ص ۲۸۰

منعقدہ ۱۹۷۵ء (۳۱/اکتوبر-۲/نومبر ۱۹۷۵ء) کے موقع پر پڑھا:

''آج پورا عالم اسلام ندوہ کی قابل تحسین وآفریں مساعی کا احساس رکھتا ہے، اور نشر و اشاعت کی ان کوششوں اور خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جو یہاں انجام دی جارہی ہیں، ان علماء کے کام اور مقام کا بھی اس کو احساس ہے جو غور وفکر میں مشغول ہیں، اور راہ خدا میں ہر طرح کی کوشش کررہے ہیں۔ (۱)

پچاسی سالہ جشن کے حوالہ سے اس حقیقت کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ علمی و بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کی قریبی پچھلی تاریخ میں کسی اجلاس میں بیرونی دنیا کے اتنے فضلاء، خاص طور پر عالم اسلام کے اتنے ممتاز علماء، اہل فکر ونظر، خطباء اور ذمہ داران مدارس و جامعات، ہمارے علم میں ہندوستان نہیں آئے، صرف بیرونی مندوبین کی تعداد (جس میں عرب مما لک کے علاوہ روس وایران کے مندوب بھی تھے) ۷۱ تھی، یہ یاد رہے کہ یہ جشن اس وقت ہوا جب ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ تھی۔

ندوۃ العلماء کو عالم عربی میں جس نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہندوستان کا جو وقار واحترام ہے، اس کے سمجھنے کے لیے عصر حاضر کے ممتاز ترین عرب ادیب وانشاء پرداز علامہ شیخ علی الطنطاوی (سابق جج اپیلنگ کورٹ دمشق، و پروفیسر بغداد یونیورسٹی، حال مقیم حجاز) (۲) کا یہ تأثر کفایت کرتا ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ندوہ ایک معتدل اور جامع راستے پر چلنے والا ادارہ ہے، یہ راستہ نہ اپنی منزل سے منحرف ہوا ہے، اور نہ اس نے اس مستقیم راہ کو چھوڑا ہے، یہ قدیم مدارس جامع ازہر وغیرہ اور جدید جامعات (یونیورسٹیوں) کے درمیان ایک معتدل اور جامع راستہ ہے، جس میں نہ قدیم مدارس کا جمود ہے، نہ جدید جامعات کی جدت پسندی، اس نے ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کیا ہے اور اس میں کامیاب ہوا ہے۔

میں ایک مرتبہ ٹیلی ویژن پر انٹرویو دے رہا تھا، مجھ سے ٹیلی ویژن کے

---

(۱) ملاحظہ ہو: روداد چمن، ص ۱۲۵

(۲) ۵/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۹/جون ۱۹۹۹ء کو حجاز میں ان کا انتقال ہوگیا، اور مکہ معظمہ میں مدفون ہوئے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ (مرتب)

نمائندے نے سوال کیا کہ وہ کون سا مقام ہے جس میں آپ اپنی زندگی کے بقیہ ایام صرف کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ میں اگر اپنے شہر (دمشق) کو واپس نہ ہوسکا اور یہاں بیت اللہ کے جوار میں بھی رہنا نصیب نہ ہوا (۱) تو میں لکھنؤ کو ترجیح دوں گا، اور یہ کہ میں ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں قیام کروں، جو ایک پر فضا محل و مقام بھی ہے اور وہاں علماء کی صحبت بھی میسر ہے۔" (۲)

ہندوستان کے فخر و مسرت کے لیے یہ بات بھی کافی ہے کہ یہاں کی ایک تعلیم گاہ اور عربی درسگاہ (دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی تالیف کردہ عربی زبان و ادب کی کتابیں ترقی یافتہ عرب ممالک کے متعدد اسکولوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہیں، اور یہاں کے بعض فضلاء عالمی (International) اسلامی و عربی ادب کی تنظیمات اور انجمنوں کے صدر و سکریٹری ہیں۔ (۳)(۴)

---

(۱) علامہ طنطاوی دمشق چھوڑنے کے بعد جو سیاسی وجوہ سے تھا، مکہ معظمہ ہی میں مقیم ہیں۔

(۲) مقدمہ کتاب "في مسيرة الحياة" ص ۱۳

(۳) جیسے رابطة الأدب الإسلامي العالمية اور Centre For Islamic Studies, Oxford University

(۴) ماخوذ از رسالہ "دینی عربی مدارس کا تعلیمی، تربیتی اور وطنی کردار، اور ہندوستان کے لیے ان کا باعث افتخار ہونا" (ص ۳-۱۷) اور پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ جنوری ۱۹۹۵ء)۔

مدارس وجامعات کا بہترین تعارف

زندگی کا تعلق صرف جسم سے نہیں ہے

بعد حمد وصلوۃ!

اللہ کا یہ قانون تربیت اور قانون رحمت ہے کہ وہ بیج پھلے اور پھولے گا اور اس کے اندر سے انسانی زندگی کی پرورش کا سامان پیدا ہوگا جو زمین میں ڈالا جائے گا۔

لیکن انسانی زندگی صرف اس جسم کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ اور اس سے پہلے اس کے دل ودماغ کا نام ہے، تو اگر انسانی جسم کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی مقدار میں اتنا بڑا سامان پیدا کیا ہے کہ جو اگر ہم جیسے انسانوں کی نا قابلیت اور بددیانتی اور بدنیتی نہ ہوتو ساری دنیا کی پرورش کے لیے بالکل کافی تھا، اگر ہمارے اعمال خراب نہ ہوتے، ہماری نیتوں میں فتور نہ ہوتا، ہم میں اس نعمت کی قدر کرنے کا جذبہ ہوتا۔

مدرسہ کا نسبی تعلق

تو اللہ تعالیٰ کا جو قانون ہزاروں یا لاکھوں برس سے کام کر رہا ہے، اس کی طرف سے کوئی بخل نہیں ہے، پانی میں کوئی کمی نہیں، غلے اور پھولوں میں کوئی کمی نہیں، اسی طریقہ سے دل ودماغ کی پرورش اور دل کو روشنی اور دماغ کو طاقت پہنچانے کے لیے اور اس کو صحیح رہنمائی عطا کرنے کے لیے اللہ نے نبوت کا سلسلہ پیدا کیا اور اس نبوت نے اسی طریقہ سے انسانی دل ودماغ کو صالح اور صحت مند غذا پہنچائی جس سے دل ودماغ نے صحیح طور پر کام کرنا شروع کیا، نبوت کی انھیں کوششوں کی ایک سنہری کڑی مدرسہ ہے۔

مدرسہ کا وسیع مفہوم

مدرسہ اپنے وسیع معنی میں یعنی وہ جگہ جہاں اجڈ، بے تربیت اور بدسلیقہ انسان کو جو اپنی فطرت پر ہے اور کچھ نہیں جانتا، اس کو سلیقہ اور زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا جائے، مالک کی پہچان کرائی جائے، اپنی زندگی کے صحیح مقصد سے آشنا کیا جائے اور اس کو بتایا جائے کہ ایک شریف، خدا ترس، خدا سے ڈرنے والا اور خدا کی مخلوق سے محبت رکھنے والا (اجاڑنے، بگاڑنے اور تاراج کرنے والا نہیں) بلکہ اس دنیا کو جنت کا نمونہ بنانے کی کوشش کرنے والا کیسا ہوتا ہے؟ اس کو اس کے لیے کیا ہنر سیکھنا چاہیے؟ اس کے لیے کیا تعلیم حاصل کرنی چاہیے؟ اس کے لیے اپنے نفس پر کس طرح قابو حاصل کرنا چاہیے؟ اس کو کس طرح اپنے نفس کو لگام دینی چاہیے، اور بے لگام جانور کی طرح نہیں چھوڑنا چاہیے؟ اس کے لیے خدا کے پیغمبروں نے علم کا سلسلہ اور علم کا چشمہ جاری کیا۔

حضرات! Convocation کے موقع پر کسی بڑے دانشور اور کسی بہت پڑھے لکھے انسان کا انتخاب کیا جاتا ہے، جو وہاں سند لینے والوں اور اس جامعہ سے گریجویٹ ہو کر اور اس یونیورسٹی سے فارغ ہو کر نکلنے والوں کو پیغام دے اور اپنی زندگی کے تجربوں کا نچوڑ ان کے سامنے پیش کرے کہ تمھیں کیا بننا چاہیے، اور کیسا بننا چاہیے، جامعہ یا اس یونیورسٹی کا تمہارے اوپر کیا حق ہے، اور اس بستی اور تمہاری جیسی برادری اور اس معاشرہ کا جس سے تم تعلق رکھتے ہو؛ تم سے کیا مطالبہ ہے؟ کیا تقاضا ہے؟ اور تمہارے اوپر اس کا کیا حق ہے؟

اس کے لیے آپ سنتے ہوں گے کہ ہر سال ہر یونیورسٹی کا ایک Convocation ہوتا ہے، تقسیم اسناد کا جلسہ ہوتا ہے، اس میں ملک کے کسی بڑے اونچے درجہ کے کسی پڑھے لکھے انسان کو، کسی فاضل کو، کسی اسکالر کو، کسی Educationist کو بلایا جاتا ہے اور وہ اپنا پیغام دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ آپ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر اور یہاں پڑھ لکھ کر نکلے ہیں تو آپ کو کیا کرنا چاہیے؟ آپ میں کیا صفات اور کیا Qualities ہونی چاہئیں، اور آپ کا کیسا Character ہونا چاہیے؟

جامعہ کا صحیح تعارف

آج جامعہ کی بنیاد پڑ رہی ہے، جامعہ آباد کی بنیاد پڑ رہی ہے، اور وہ مبارک وقت بھی آئے گا جب یہاں کے طلبہ کو ڈگریاں دی جائیں گی اور سندیں تقسیم کی جائیں گی، یا ہمارے قدیم مدرسوں کی اصطلاح میں ان کی دستار بندی ہوگی اور اس وقت کوئی فاضل آ کر ان کو پیغام دیں گے اور بات کریں گے۔

لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کسی جامعہ کا صحیح الفاظ میں تعارف اور اس کا مکمل تخیل اور اس سے فارغ ہونے والوں کی صفات کا خلاصہ قرآن مجید جیسی کتاب میں (جو لافانی کتاب ہے، جو انسانیت کا صحیفہ ہے، جو قیامت تک باقی رہنے والی ہے، اور جس سے ساری دنیا کو پیغام اور رہنمائی ملی ہے) کیا کسی ایسے جامعہ کا تخیل بھی اس کے اندر پایا جاتا ہے؟ چند لفظوں میں بتا دیا گیا ہو کہ جامعہ کس لیے ہوتا ہے اور اس سے پڑھ کر نکلنے والوں کو کیسا بننا چاہیے، ان میں کیا صفات ہونی چاہئیں؟ تو میں وہی آیتیں پڑھوں گا جو ابھی قاری نے پڑھیں: ﴿يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ، وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا، وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً، وَكَانَ تَقِيًّا، وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ [سورة مريم: ١٢-١٤]، کسی جامعہ کے فارغ اور جامعہ میں داخل ہونے والے کے لیے اس سے بہتر کوئی پیغام اور اس سے بہتر اس کے لیے کوئی خلعت نہیں ہو سکتا جو اس کو پہنایا جائے، اس سے بہتر اس کا کوئی تعارف نہیں ہو سکتا جن لفظوں میں خدا کے اس پیغمبر کا ذکر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿يَا يَحْيَىٰ﴾ ''اے خدا کے پیغمبر یحییٰ!''، ﴿خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ﴾ ''کتاب کو مضبوط پکڑو'' سارے جامعہ کا ماحصل اس میں آ گیا کہ کتاب کو مضبوط پکڑنا ہے، آج دنیا میں کیا ہے؟ یا الکتاب نہیں ہے یا قوّت بھی نہیں ہے، یا تو پکڑنے والا ہاتھ ہے یا پکڑنے والی چیز نہیں ہے کہ کس کو پکڑے؟ ان صحیفوں کو پکڑے؟ ان کتابوں، ان لپشتاروں اور ان کاغذات کے اوراق کو پکڑے جو ہوا میں پریشان ہیں اور اڑ رہے ہیں؟ ﴿يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ﴾ الکتاب کو پکڑو جو اللہ کی آسمانی کتاب ہے، اور جس سے انسانوں کو ہدایت ملی، اور قیامت تک اسی سے ہدایت ملے گی، ﴿وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ﴾ [سورة النور: ٤٠] ''جس کے لیے اللہ ہی روشنی پیدا نہ کرے اس کے لیے

پھر کہیں روشنی نہیں ہے۔" اللہ کی نازل کی ہوئی "الکتاب" خواہ وہ زمانۂ سابق میں توریت اور انجیل کی شکل میں ہو یا اور آسمانی صحیفوں کی شکل میں ہو، جن کا ہم کو صحیح طور پر سب کا نام معلوم نہیں، اور یا وہ اللہ کی آخری کتاب قرآن شریف ہو، اس کو مضبوط پکڑنا ہے، وہی ہے جس سے ساری دنیا میں صحیح علم پھیلا، لوگوں کو خالق کائنات کی بھی، اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی بھی، اور اپنی بھی صحیح شناخت ہوئی اور ان کو صحیح معرفت حاصل ہوئی، اپنی حقیقت بھی پہچاننا بہت ضروری ہے، اگر آدمی اپنی حقیقت نہیں پہچانتا، اپنی زندگی کا صحیح مقصد نہیں جانتا اور اپنے اور خدا کے تعلق کو نہیں جانتا تو وہ کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

﴿خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾ کا صحیح مفہوم

وہ فرماتا ہے کہ اے یحییٰ! اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑو اور اس طرح پکڑو کہ ہاتھ سے گرنے نہ پائے اور کوئی تم سے چھیننے نہ پائے، اور اس طرح پکڑو کہ اس کو پڑھ کر، ایک مرتبہ سمجھ کر پھر بھولنے نہ پاؤ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى﴾ [سورة الأعلى: ٦] ہم تم کو ایسا پڑھائیں گے کہ پھر تم کہیں بھولنے نہ پاؤ گے۔ کتنے پڑھنے والے ہیں جو پڑھ پڑھ کر بھول جاتے ہیں، کتنے پڑھنے والے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے پڑھا تھا اس کے خلاف ہی کرتے ہیں، کتنے پڑھانے والے ہیں کہ پڑھا انھوں نے کچھ اور پڑھاتے ہیں کچھ، لیکن جو کچھ پڑھا اس کو یاد رکھے، جو کچھ پڑھا اس پر عمل کرے، جو کچھ پڑھا وہی دوسروں کو دے، جو کچھ صحیح زبان اور صحیح جگہ سے حاصل کیا تھا وہی صحیح طریقہ سے دوسروں تک پہنچائے، یہ سب قوت کے مفہوم میں شامل ہے۔

﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾ اے یحییٰ! کتاب کو مضبوط تھامو، مضبوط پکڑو اس طرح کہ پھر تمہارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، جیسے قوموں سے چھوٹ گئی، ملتوں سے چھوٹ گئی، افراد سے چھوٹ گئی، قوموں سے ایسی چھوٹی کہ آج ان قوموں کو ان کتابوں کے نام بھی یاد نہیں اور نہیں بتا سکتے کہ کون سی کتاب ان کو دی گئی تھی، افراد سے اس طرح سے چھوٹی کہ انھوں نے کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھا اس میں کیا لکھا ہے، اور اس کو طاق پر سجا کر رکھ دیا، ہم مسلمان بھی اس کے گنہگار ہیں کہ قرآن مجید ہم کو دیا گیا تھا عمل کرنے کے لیے، لیکن ہم نے اس کو جزدانوں میں

سجا کر، اس کو عمدہ سے عمدہ کپڑا پہنا کر اور طاق پر جو طاق نسیاں ہے، اونچے طاق پر اس کو رکھ دیا، (بڑی متبرک کتاب ہے) اور اس کے اوپر گرد جمتی رہی اور ہم نے اس کو کبھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کیا لکھا ہے، ہم نے زندگی میں اس کو منتقل نہیں کیا، ہم نے اپنی زندگی میں اس کا مظاہرہ اور Demonstration نہیں کیا اور ہم نے اپنی زندگی میں اس پر عمل کر کے نہیں دکھایا۔

قرآن کی عملی تفسیر کی ضرورت ہے

اگر آج ہم مسلمان اپنی زندگیوں میں اس کا نمونہ دکھاتے تو میں یقین کرتا ہوں کہ آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا! آج خود ہمارے ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، کیسی محبت ہوتی، کیسی دیانتداری ہوتی، کیسا فرض کا احساس ہوتا، کیسے ملک کی خدمت کا جذبہ ہوتا، کیسے خدا کی معرفت گھر گھر عام ہوتی، سب اس دنیا کے اور اس ملک کے رہنے والے اپنے معبود کو پہچانتے، انسان کا مرتبہ پہچانا جاتا، اگر اس کتاب پر اپنی زندگیوں میں عمل کر کے ہم مسلمان دکھاتے تو سب کو معلوم ہوتا کہ انسان کا کیا مرتبہ ہے، انسان کیسی قیمتی چیز ہے، انسان خدا کا کیسا پیارا ہے، ﴿وَآتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ ''اور ہم نے اس کو بچپن ہی میں حکمت دی''، اب اگر خدا کسی کو حکمت دیتا ہے اور اس کا سینہ کھولتا ہے، اس کو علم لدنی حاصل ہوتا ہے تو سبحان اللہ! لیکن ہر ایک کی قسمت کہاں! اس لیے ایسے مدرسے قائم کیے جاتے ہیں، یہاں سے ابتدائی مدرسوں کی بنیاد پڑی ﴿وَآتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾۔

اہل مدارس کا باطن کس طرح ہونا چاہیے؟

اور پھر اس کے بعد پڑھ لکھ کر بے درد بننا نہیں ہے، ظالم بننا نہیں ہے، انسان کا شکاری بننا نہیں ہے، کام چور، غلہ چور اور دولت چور بننا نہیں ہے، بلکہ پڑھ لکھ کر اور محبت بڑھنی چاہیے، پڑھ لکھ کر دل سے انسانوں کی محبت کے چشمے ابلنے لگیں اور دل کو موم کی طرح پگھلنا چاہیے، دل کو پتھر نہیں ہونا چاہیے بلکہ موم ہونا چاہیے، فولاد نہیں ہونا چاہیے، فولاد ہونے کا موقع وہ ہے کہ جب کوئی بہت اہم مقصد ہو، ورنہ دل کو تو ریشم بننا چاہیے، دل کو تو بہتے ہوئے پانی کی طرح ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا﴾ ہم نے اپنی طرف سے اس کے دل میں محبت

کا چشمہ بہایا، محبت کا چشمہ ابلنے لگا، ہر ایک پر ترس کھانا، ہر ایک کے لیے آنسو بہانا، ہر ایک کا غم اپنا غم بنا لینا، ہر ایک کے لیے تڑپنا، ہر ایک کے لیے پگھلنا اور سلگنا، ہر ایک کے لیے جلنا اور ہر ایک کے غم میں گھلنا، یہ ہر پڑھے لکھے انسان کا شعار اور Moto ہونا چاہیے، کہ وہ جب کسی انسان کی مصیبت دیکھے تو اس کا دل پگھل جائے، اس کی آنکھ سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگے اور وہ تڑپ کر مر جائے، اس کو کھانے میں مزہ نہ آئے، پینے میں مزہ نہ آئے، جیسے حضور (ﷺ) تھے کہ جب قیدی آئے جنھوں نے آپ کے اوپر تیر چلائے تھے، جنھوں نے آپ پر پتھر برسائے تھے، جنھوں نے آپ کو گالیاں دی تھیں، جنہوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، جنھوں نے آپ کے ساتھ وہ سلوک کیا تھا جو کوئی کسی خونخوار جانور کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا، جب وہ قید ہو کر آئے تو رات بھر آپ کو نیند نہ آئی کہ ان بیچاروں کے ہاتھ پاؤں پر ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، کسی کی کراہ سن لی تو آپ (ﷺ) بے قرار ہو جاتے تھے، اور اگر نماز میں (کہ جس سے بڑھ کر کے کوئی آپ کے لیے محبوب مشغلہ نہیں تھا، فرماتے تھے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے،(۱) لیکن کسی بچہ کا رونا سن لیتے تھے تو جلدی نماز ختم کرتے تھے کہ معلوم نہیں کہ اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی،(۲)۔ وہ نبی رحمت جس کی رحمت ومحبت کا یہ حال تھا، اس کے نائبین جو علماء، فضلاء، جامعہ سے نکلنے والے اور مدارس سے فارغ ہونے والے ہیں ان کا دل کیسے سخت ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ﴿وَحَنَاناً مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكوٰةً﴾۔

پاک دل و پاکباز

ہاں اپنی طرف سے ہم نے اس کو محبت وشفقت دی، ترس کھانا سکھایا، پاکی اور ستھرائی دی، اس کے اخلاق پاکیزہ، اس کا جسم پاک، اس کے کپڑے پاک، اس کے ارادے پاک، اس کی نیتیں پاک، اس کے کام پاک، یہ لفظ ''زکوۃ'' سب کو شامل ہے: ﴿وَحَنَاناً مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكوٰةً﴾، وہ سراپا پاکی تھا، وہ مجسم پاکی تھا، ﴿وَكَانَ تَقِيّاً﴾ وہ چالاک نہیں تھا، وہ مال

(۱) أحمد في مسنده، حديث رقم ۱۲۳۱۸، ۱۲۳۱۹، ۱۳۰۸۸، ۱۴۰۸۳

(۲) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي، رقم ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰

حاصل کرنے اور دولت بڑھانے کے نئے نئے اور ہوشیاری کے طریقے نہیں جانتا تھا، بلکہ ﴿وَكَانَ تَقِيّاً﴾ اس کے اندر احتیاط تھی، اس کے اندر ہر ایک کا خیال تھا، کسی کو تکلیف نہ پہنچنے پائے اور کسی کا حق نہ مارا جائے، ﴿وَبَرّاً بِوَالِدَيْهِ﴾ اور اپنے ماں باپ کا بڑا فرماں بردار، بڑا سپوت، ان کا بڑا خدمت گزار اور اطاعت شعار، ﴿وَلَمْ يَكُنْ جَبَّاراً عَصِيّاً﴾ اور وہ بہت سختی کرنے والا، نافرمان، سرکش، ضدی، ہٹ دھرم اور مغرور نہیں تھا۔

مدارس و جامعات کے لیے بہترین چارٹ

یہ جامعہ کے فارغ کا اور اس کے مقاصد کا بہترین سراپا ہے، بہترین حلیہ اور بہترین نقشہ ہے، بہترین تعارف اور بہترین چارٹ ہے۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ایک جامعہ بننے والی ہے، اس میں ہم چاہتے ہیں کہ ایک چارٹ لگائیں کہ اس جامعہ کے فضلاء، وہاں کے اساتذہ اور وہاں کے طلبہ کے کیا اخلاق ہونے چاہئیں؟ تو میں یہ آیت دوں گا کہ اس آیت کو بہت سنہرے حروف سے خوشخط لکھ کر اور اس کا ترجمہ کروا کر اس جامعہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا جائے: ﴿يَا يَحْيَى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ، وَ آتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيّاً، وَحَنَاناً مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً، وَكَانَ تَقِيّاً، وَبَرّاً بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّاراً عَصِيّاً﴾۔

بس میں ان الفاظ کے ساتھ اس جامعہ آباد کے قیام پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اس جامعہ کے پڑھنے والے اور اس جامعہ سے پڑھ کر نکلنے والے ان اخلاق وصفات کے حامل ہوں اور وہ دنیا میں نمونہ پیش کریں، یہ بستی نور کی بستی ہو، برکت کی بستی ہو، رحمت کی بستی ہو، علم وعرفان کی بستی ہو، یہاں سے علم کے دھارے اور علم کے چشمے بہیں اور اس بستی کے آس پاس کو ہی نہیں بلکہ دور دور کے شہروں کو، دیہاتوں کو، جنگلوں کو، اور پورے ملک کو اور ملک سے باہر نکل کر دوسرے ملکوں کو سیراب کریں، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور آج کے دن کو ہر طرح سے ہمارے اور آپ کے حق میں مبارک فرمائے۔ آمین (۱)

(۱) جامعہ آباد، بھٹکل کے افتتاح کے موقع پر ۳/۷۱۹۷ء میں کی گئی تقریر، ماخوذ از ''ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام''، ص:۶۳ – ۷۰۔

دینی مدارس کے وجود کا مقصد

انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد و آله وصحبه أجمعين ،ومن تبعهم بإحسان و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين. أما بعد، فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ، بسم الله الرحمن الرحيم:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلآئِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْآ أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلآئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُوْنِيْ بِأَسْمَآءِ هٰؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ، قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ، قَالَ يَآدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ، فَلَمَّآ أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّيْ أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾

[سورة البقرة: ۳۰-۳۳]

(جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، فرشتوں نے عرض کیا: کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جارہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خوں ریزی کرے گی؟ حالانکہ ہم تیری حمد وثنا کرتے ہوئے تیری پاکی اور قدوسی کا اقرار کرتے ہیں(تیری

مشیت برائی سے پاک اور تیرا کام نقصان سے منزہ ہے)۔ اللہ نے کہا: میری نظر جس حقیقت پر ہے تمھیں اس کی خبر نہیں، (پھر جب ایسا ہوا کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ چاہا ظہور میں آگیا) اور آدم نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لیے تو اللہ نے فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کر دیے اور فرمایا: اگر تم (اپنے شبہ میں) درستی پر ہو تو بتاؤ ان (حقائق) کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا: خدایا! ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے ہی لیے ہیں، ہم تو اتنا جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلا دیا ہے، علم تیرا علم ہے اور حکمت تیری حکمت (جب فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تو) حکم الٰہی ہوا: اے آدم: تم (اب) فرشتوں کو ان (حقائق) کے نام بتا دو، جب آدم نے بتا دیے تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان اور زمین کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں، اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے، اور جو کچھ تم چھپاتے تھے وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں۔ (۱)

حضرات! جہاں اسٹیج پر کثیر التعداد اور کثیر الحیثیات حضرات جمع ہوں، وہاں نام لے کر ان کو مخاطب کرنا نازک ذمہ داری کی بات؛ بلکہ ایک خطرناک کام ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر کوئی اہم نام مجھ سے چھوٹ جائے گا تو بجائے فرض کی ادائیگی کے کوتاہی سمجھی جائی گی۔ اس لیے میں اپنی گزارش حضرات کہہ کر شروع کرتا ہوں۔

ہندوستان کے سارے مدارس حضرت خواجہ اجمیریؒ کے عزم صادق کے مرہون منت ہیں

یہاں میں جس وقت حاضر ہوا بغیر کسی تکلف اور بغیر کسی جستجو کے میرے ذہن میں ایک شعر تازہ ہوا اور میں اسی سے اپنی تقریر کا آغاز کرتا ہوں ؂

---

(۱) آیات کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن (جلد دوم: ص۲۲ تا ۲۴) سے ماخوذ ہے کہ وہ مضمون کے اسلوب اور مقاصد سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور آیات کے وسیع و عمیق معانی کے سمجھنے میں زیادہ معاون ہے (ترجمان القرآن [illegible] نئی دہلی)

عزم راسخ ہے نشان قیس و شان کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت وکوہسار

لیکن جب میں عزم راسخ کا ذکر کرتا ہوں تو بے اختیارانہ و مضطربانہ میرا ذہن اس جلیل القدر صاحب عزم انسان کی طرف جاتا ہے جس سے نہ صرف راجپوتانہ کی سرزمین؛ بلکہ سارے ہندوستان کو فخر ہے، اور جس سے عزم راسخ، خلوص اور خدا کی محبت اور انسانیت کی خدمت کے جذبے کی تاریخ کو روشنی ملتی ہے۔ میرا اشارہ حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (رحمۃ اللہ علیہ) کی طرف ہے، جنھوں نے اپنے عزم راسخ، اپنی ایمانی قوت، سچی روحانیت، خداپرستی وانسان دوستی اور اپنے یگانہ خلوص ومحبت سے زمین فتح نہیں کی، ملک فتح نہیں کیا، دل فتح کیے، انھوں نے دل توڑنے کا کام نہیں کیا، دل جوڑنے کا کام کیا، ان کی روشن کی ہوئی شمع اس وقت روشن ہے۔

میں تاریخ کی روشنی میں عرض کررہاہوں کہ ہندوستان کے سارے مدارس (جن میں ایک نمایاں مقام انشاء اللہ اس ''جامعہ ہدایت'' کا بھی ہوگا) اور اس وقت علم ودانش کے سارے مراکز مرہون منت ہیں حضرت خواجہ اجمیری کے اس عزم صادق کے، جوان کو ایران سے لایا اور اجمیر میں بٹھایا، اور یہاں ان کے دم سے شمعیں فروزاں ہوئیں، علم کے اور عقل ودانش کے چراغ روشن ہوئے، اور سچی روحانیت اور خدمت انسانیت کا جذبہ ازسرنو بیدار ہوا۔

چراغ ہدایت

لیکن سچ پوچھیے تو ان چراغوں کے تذکرے سے وہ چراغ اولین وآخرین، وہ چراغوں کا چراغ (سراج منیر) یاد آتا ہے جس کی بدولت ان سب چراغوں کو روشنی ملی:

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

وہ چراغ رسالت تھا جو مکہ معظّمہ کی سرزمین پر روشن ہوا، اور اس پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس کا آغاز لفظ ''اِقْـرَأْ'' (پڑھو) سے کیا گیا۔ اس معنی خیز، دوررس اور مبارک آغاز کے

طفیل اور اس کی نبوت کے فیض اور اس کی صحبت وتربیت وتعلیمات سے جس نئے علمی وتعلیمی دور کا آغاز ہوا، اور علم ودانش، تحقیق وتصنیف اور تعلیم وتدریس کی جو عالمگیر تحریک وسرگرمی پیدا ہوئی، اس کو سب جانتے ہیں۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا انھیں کی لگائی ہوئی ہے

مکالمۂ قرآنی

حضرات! ہم آپ سب قرآن مجید کے اس مکالمہ کو پڑھتے رہتے ہیں جس کا قرآن مجید نے تذکرہ کیا ہے، جو خدا اور اس کے فرشتوں کے درمیان ہوا، جب خدا نے یہ فیصلہ کیا کہ نسل انسانی کے مورث اعلیٰ آدم کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ (نائب) بنائے گا اور اس کائنات ارض کا چارج دے گا، اس کو صحیح رخ پر لگانے، کائنات کی مختلف طاقتوں کو متحد ومنظّم کرنے، اس کائنات کو با مقصد اور اس زندگی کو با معنی بنانے کے لیے، انسانوں کا خدا سے رشتہ جوڑنے، اور انسانوں انسانوں کے درمیان اخوت وتعاون کا رشتہ استوار کرنے اور خدا کی نعمتوں سے اس کے احکام وتعلیمات کے مطابق فائدہ اٹھانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کا فیصلہ ہوا کہ اس کے لیے ایسے انسان کو پیدا کرے جو اقبال کے الفاظ میں: ''خاکی ونوری نہاد --- بندۂ مولی صفات!'' ہو، تو فرشتوں نے عرض کیا: ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾، [سورۃ البقرۃ: ۳۰] ''کیا ہم آپ کے خادم وغلام اس کام کے لیے موزوں نہ تھے؟ ہم تو آپ کی تسبیح وتقدیس میں ہر وقت لگے رہتے ہیں۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ابھی تم کو معلوم ہو جائے گا جس جگہ کے انتظام کے لیے ہستی کا میں انتخاب کر رہا ہوں، وہ انتخاب کتنا برمحل اور حق بجانب ہے! چنانچہ حضرت آدم (علیہ السلام) اور فرشتوں کا امتحان لیا گیا، پہلے حضرت آدم (علیہ السلام) کی فطرت میں ان ناموں کے سیکھنے، اور جن کے نام ہیں ان سے آشنا ہونے، ان کی صلاحیتوں، طاقتوں سے واقف ہونے اور ان سے فائدہ اٹھا سکنے کی صلاحیت اور ان کی فطرت میں ان کی ضرورت کا احساس پیدا کیا گیا، ان کے اندر یہ

طاقت ودیعت کی گئی کہ ان کا رشتہ اس مادی کائنات کی چیزوں سے بآسانی قائم ہوسکے اور وہ ان سے کام لے سکیں، تو پہلے حضرت آدم (علیہ السلام) کو تعلیمِ اسماء ہوئی، ﴿ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَآئِكَةِ ﴾ ، وہ چیزیں ان کو پیش کی گئیں اور انھوں نے صحیح جواب دیے، ملائکہ کے سامنے لایا گیا تو انھوں نے اپنی شان کے مطابق اس کا اعتراف کیا کہ ان کا علم خدا کی تعلیم کے اندر محدود ہے اور ان کو صرف اپنے فرائض منصبی کا علم ہے: ﴿ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴾ ، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ثابت کردیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نائب بن کر اس کائنات سے فائدہ اٹھانے کے لیے جس ہستی کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔

انسانی وجود کا مقصد

حضرات! ان آیات کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ یہاں پر انسان خدا کا نائب ہے، انسان یہاں پر اصل نہیں، وہ Original حیثیت نہیں رکھتا ہے، وہ خدا کا نائب ہے، خدا کا منشا پورا کرنے کے لیے اس دنیا میں آیا ہے۔ علم کی تاریخ میں بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ میں جو سب سے بڑا خطرناک موڑ آیا اور میں سمجھتا ہوں سب سے بڑا حادثہ پیش آیا، وہ یہ تھا کہ انسان یہ بھول گیا کہ وہ نائب خدا ہے، وہ خلیفۃ اللہ ہے، دنیا کا مالک اور ایسا حاکم ومختار نہیں کہ اس دنیا میں خدا نے زمین کے اندر، زمین کے اوپر، پہاڑوں کے اوپر اور اندر جو دولتیں اور طاقتیں پیدا کی ہیں، بجائے خود اور بطورِ خود حسبِ منشا استعمال کرے، اپنے جذبات، خواہشات اور اپنے مفادات میں، قومی اور نسلی مفادات میں، برادریوں کے مفادات میں، سیاسی مفادات میں، یا ملکی مفادات میں، یا اس سے زیادہ تنگ اور محدود ذاتی مفادات میں استعمال کرے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے انسانیت کا قافلہ، علم کا قافلہ راستہ بھولا ہے، اسے صحیح راستے پر رکھنے والی جو طاقت تھی، وہ یہ تھی کہ انسان کبھی یہ نہ بھولے کہ وہ اصل نہیں ہے، بلکہ وہ نائب ہے، وہ اس جہاں کا مالک نہیں ہے، وہ اس کائنات کا بادشاہ نہیں ہے، وہ تو حقیقی بادشاہ کا یہاں نائب ہے، نائب کہہ لیجیے، انچارج کہہ لیجیے، ایڈمنسٹریٹر کہہ لیجیے، "Owner" نہیں ہے۔

انسانیت کی سب سے بڑی غلطی

حضرات! علم کی تاریخ میں نہیں بلکہ انسانیت کی تاریخ میں جو سب سے بڑی بھول ہوئی ہے، سب سے بڑی غلطی ہوئی ہے، ایسی بھول جو دو ایک آدمیوں کی نہیں ہے، علم و دانش، قیادت و رہنمائی کی بھول ہے، وہ یہ کہ انسان نے اپنے کو اس دنیا کا مالک سمجھنا اور اپنے کو اصل سمجھنا شروع کر دیا، وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اس دنیا کی تمام نعمتوں کو اور طاقتوں کو اور جو فطری جوہر پیدا کیے گئے ہیں، ان سب کو اپنی منشا کے مطابق اپنے مفاد میں آزادانہ استعمال کر سکتا ہوں، (اور میں عرض کروں گا، ذاتی مفاد سے لے کر ملکی مفاد تک، ملکی مفاد سے لے کر بین الاقوامی مفاد تک، اور میں اس زمرہ میں اقوام متحدہ تک کو شامل کرتا ہوں) یہ صرف خود پرستوں کی غلطی نہیں ہے، یہ صرف چند نفس پرستوں کی غلطی نہیں ہے جو اٹھتے تھے دنیا کے اس حصہ سے اس حصہ تک آبادیوں کو تہس نہس کرتے ہوئے، ہری کھیتیاں جلاتے ہوئے، شہروں کو بے چراغ بناتے ہوئے، اور انسانیت کو پامال کرتے ہوئے، اور انسانی سروں کے مینار کھڑے کرتے ہوئے، انسانیت کے خون کا دریا بہاتے ہوئے چلے آتے تھے۔ یہ کہانی چند نفس پرستوں کی نہیں ہے جس میں سے کسی کا نام ''سیزر'' ہے، کسی کا نام ''نیرو'' ہے، کسی کا نام ''سکندر اعظم'' ہے، کسی کا نام ''چنگیز خاں'' ہے، یہ چند قوموں کی بھی کہانی نہیں ہے جنھوں نے قوموں کو غلام بنایا، جنھوں نے ملکوں کو غلام بنایا، یہ کہانی ہے انسانیت کی، یہ رونا ہے تقدیر انسانی کا، آپ غلطیوں کا نسب نامہ تیار کریں، بڑے سے بڑا شجرۂ نسب تیار کریں اور بڑے سے بڑے مؤرخ انسان کا انتخاب کریں، اس کو یونیسکو سے لائیں، آپ امریکہ کی کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی سے لائیں اور کہیں کہ غلطیوں کا ایک نسب نامہ ہوتا ہے، مولانا آزاد نے مخصوص بلاغت کے انداز میں کہا تھا کہ ''غلطی سے زیادہ کثیر الاولاد کوئی شے نہیں''، ایک غلطی ہو جائے تو غلطیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، ہمیں تاریخ اقوام بتاتی ہے، قوموں سے قوموں کا معاملہ کرنے کی تاریخ بتاتی ہے، عدل و انصاف کی تاریخ بتاتی ہے، ظلم وسفا کی کی تاریخ بتاتی ہے، اولوالعزم اور حوصلہ مند انسانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک غلطی سے ہزاروں

غلطیاں پیدا ہوئیں، لیکن میں کہوں گا اور ایسے ممتاز مجمع سے مجھ میں کہنے کا اور بھی زیادہ حوصلہ پیدا ہو رہا ہے کہ دنیا کی جتنی غلطیاں ہوئی ہیں اور دنیا میں جتنے انہونے واقعات پیش آئے ہیں، انسان نے انسان کے گلے پر چھری چلائی ہے، انسان نے انسان کے ساتھ جانور سے بدتر سلوک کیا ہے، انسان نے انسان کو گھوڑا اور بیل بنایا، انسان نے انسان پر لوہے اور لکڑی کی طرح ظلم وستم کیے، ان ساری سفاکیوں، ان ساری گندگیوں، ان ساری بے جا کوششوں، ان ساری انسانیت کی پامالیوں کا نسب نامہ اگر کسی جگہ ختم ہوتا ہے تو وہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے کو اس دنیا کا مالک سمجھا، اور زندگی کی رہنمائی اور زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے اپنے ارادہ کو، اپنی خواہش کو، اپنے فائدہ کو، اپنے مطلب کو اور اس سے بڑھ کر اپنی عزت، اپنے خاندان کی عزت، قوم کی عزت کو اس نے معیار بنایا، اسٹینڈرڈ بنایا۔

سب سے بڑا سانحہ

سب سے بڑا سانحہ جو پیش آیا، وہ یہ کہ ''علم'' کا رشتہ دینے والے سے ٹوٹ گیا، انسان نے علم کس سے لیا وہ اس کو بھول گیا، آج دنیا کا جو نقشہ ہے، مجھے سیاسی مبصرین معاف کریں، مجھے ملکوں کے منتظمین معاف کریں، مجھے سیاسی پارٹیوں کے رہنما معاف کریں، مجھے بڑی درسگاہوں سے تعلق رکھنے والے معاف کریں، یورپ و امریکہ کے تمدن کو دیکھ کر جن کی نگاہیں خیرہ ہوجاتی ہیں، اور اس تمدن پر فخر کرنے والے معاف فرمائیں کہ سب سے بڑی غلطی جس کو عربی میں کہوں تو ''أم الأمراض'' اور اپنی زبان میں کہوں تو غلطیوں کو جنم دینے والی غلطی کہوں گا، وہ انسان کی یہ بھول ہے کہ وہ اپنے کو اس جگہ کا اصل اور مالک سمجھ بیٹھا ہے، ایک مرتبہ وہ بھولا کہ وہ کہاں سے آیا ہے تو پچاس مرتبہ وہ بھولا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اور اس دنیا کی چول اس وقت تک درست نہیں ہوسکتی، لکھنے والے لکھ لیں اور یاد کرنے والے یاد کرلیں، اور دنیا کے گوشہ گوشہ تک اگر میری آواز پہنچ سکتی تو پہنچا دیں کہ اس دنیا کی چول اس وقت تک نہیں بیٹھ سکتی جب تک انسان یہ تسلیم نہ کرے کہ وہ کسی کا بنایا ہوا ہے، کسی کا بھیجا ہوا ہے اور پھر اس کو اسی کے پاس جانا ہے، جس علم کی ڈوری اس نے پکڑی تھی، اس علم کی ڈوری

کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا خالق کائنات کے ہاتھ میں ہے، وہ معلم الملکوت کے ہاتھ میں ہے، رب العالمین اور خالق علم کے ہاتھ میں ہے، اگر یہ ڈوری چھوٹ گئی تو پوری انسانیت کی ہلاکت ہے، اور اگر یہ ڈوری نہیں چھوٹی لیکن انسان بھول گیا کہ اس ڈوری کا آخری سرا وہاں سے ملتا ہے، تو پھر اس کی زندگی کا پورا رخ غلط ہو جائے گا، اور پھر یہ انسانیت ایک بازی گاہ، ایک مذبح بن جائے گی، یہ جگہ میدان جنگ میں تبدیل ہو جائے گی، اور یہاں پر غلامی و بندگی کی اتنی قسمیں، تذلیل وظلم کی اتنی قسمیں، ناانصافیوں کی اتنی قسمیں پیدا ہوں گی جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

دینی مدارس کے وجود کا مقصد

حضرات! عربی مدارس کی طرف سے اگر میں بولنے کا حق رکھتا ہوں تو میں ان سب کی طرف سے ذمہ داری کے ساتھ یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ ان سب دینی مدارس کے وجود کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو اور طالب علموں کو پہلے اور ان کے ذریعہ دوسروں کو یہ بتاتے رہیں کہ علم کا دینے والا کون ہے؟ اور علم کا سکھانے والا کون ہے؟ اور ہماری حیثیت اس دنیا میں کیا ہے؟ ہم اس دنیا کے سیاہ وسپید کے مالک نہیں ہیں، ہم اس دنیا کے کرتا دھرتا نہیں ہیں، خلیفۃ اللہ (خدا کے نائب) اور اس کی طرف سے مامور ومحکوم ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [سورة آل عمران: ٢٦]

”کہو کہ اے خدا! اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے، اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے، بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔“

حضرات! جتنے عربی مدارس ہیں وہ اس لیے قائم نہیں کیے گئے ہیں کہ اس علم کی ڈوری کو جو انسانوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، اس کو ہلاتے رہیں، اس کو حرکت دیتے رہیں، معلوم ہو کہ انسان کے ہاتھ میں حرکت ہے اور ڈوری میں متحرک ہونے کی صلاحیت؛ لیکن ان کا اصل

کام یہ ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ یہ ڈوری کس کے ہاتھ میں ہے، اور صرف اس علم کی ڈوری ہی نہیں؛ بلکہ پورے قانون قدرت کی ڈوری، عزت وعلم کی ڈوری، علم وجہالت کی ڈوری، خوش قسمتی اور بدقسمتی کی ڈوری، سربلندی اور پستی کی ڈوری، سب کسی اور ذات کے پاس ہے۔

آج ہماری سوسائٹی، ہمارے معاشرے، ہماری تہذیب کی سب سے بڑی غلطی اور اس کی بدقسمتی کا راز یہ ہے کہ وہ اس ڈوری کو، وسائل کو اصل سمجھ بیٹھی ہے، آج دنیا میں وہ سارے وسائل وجود میں آرہے ہیں جو اس سے پہلے خواب وخیال میں نہ تھے، آج ان وسائل کے مالک اس معاشرے کو درست کرنا چاہتے ہیں، وہ اس دنیا کو تباہی سے بچانا چاہتے ہیں لیکن ان کے بنائے کچھ نہیں بنتی۔

دینی مدارس کا پہلا کام

میں ایک بات تو یہ کہتا ہوں کہ ہمارے عربی مدارس کا (بغیر کسی تواضع وانکساری و معذرت کے کہتا ہوں) پہلا کام یہ ہے (اور یہ مدارس اس وقت تک مدارس وجامعات ہیں جب تک یہ فرض انجام دیں) کہ علم کی ڈوری کو خالق کائنات سے جوڑے رہیں، اس علم کے (جو اقبال کے الفاظ میں علم اُشیاء کی جہاں گیری ہے) صحیح استعمال کی ہدایت کرتے رہیں، اقبال کہتے ہیں۔

ولایت پادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

پہلی بات یہ ہے کہ اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کا نائب ہے تو اسے خدا کا منشا معلوم کرنا چاہیے، جو پیغمبروں کے ذریعہ اور پیغمبروں کے لائے ہوئے صحیفوں کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، اس کو اپنے اندر ان صفات کا پرتو پیدا کرنا چاہیے، وہ خدا رب العالمین ہے، (سارے جہانوں کا پروردگار ہے)، رحیم وکریم ہے (نہایت رحم والا عزت والا ہے)، عادل وحلیم ہے (منصف اور بردبار ہے)، رحمٰن ورحیم ہے، (بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے)، اس لیے خدا کے دیے ہوئے علم کو اس کی ربوبیت عامہ، رحمانیت تامہ اور عدل کامل کے مطابق

استعمال کرے، اگر اس علم کا استعمال نفسانی و شیطانی اغراض کے لیے کیا گیا تو یہ خلافت الٰہی کے مقصد و منصب کے ساتھ غداری، اور اپنے مورث اعلیٰ (آدم علیہ السلام) کے ساتھ بے وفائی و ناخلفی ہوگی۔

ہمارے مدارس کا یہی کام ہے کہ ضلالت و جہالت کے اندھیرے میں ہدایت کے چراغ جلاتے رہیں، اور بتاتے رہیں کہ علم خدا کی خاص صفت ہے، علم خدا کا عظیم عطیہ ہے اور اس کے منشا کے مطابق استعمال ہونا چاہیے۔

دینی مدارس کا دوسرا کام

دوسری بات یہ کہ آج کا علم، ہماری سائنس، ہمارا موجودہ نظام تعلیم وسائل مہیا کرتا ہے، اس کو مقاصد سے کوئی سروکار نہیں، مقاصد پر اس کو دسترس بھی نہیں ہے، ہمارے عربی مدارس جو خدا کے پیغمبروں کے پیغام کو پہنچانے، سمجھانے اور تشریح کرنے کے لیے قائم ہوتے ہیں، ان کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ بتائیں کہ وہ صحیح مقاصد کا علم اور ان کی تکمیل کے لیے وسائل کے استعمال کا عزم پیدا کرتے ہیں۔

موجودہ تمدن کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے پاس وسائل آگئے ہیں مگر ہمارے پاس نہ صحیح مقاصد ہیں، نہ ان کے حصول و تکمیل کے لیے قوی و صالح محرکات "Motives" ہیں۔ آج انسانی تہذیب کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ صالح مقاصد اور صحیح و قوی محرکات عمل کا نہ صرف فقدان ہے؛ بلکہ تخریبی مقاصد، انسانیت کش محرکات کا غلبہ اور تسلط ہے۔ لندن یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر "C.M.Good" کہتا ہے:

"طبعی علوم (فزکس اور سائنس) نے ہم کو وہ طاقتیں بخش دی ہیں جو خدا کے لائق تھیں؛ لیکن ہم ان کو بچوں اور وحشی قوموں کی سطح کے دماغوں کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔"(۱)

کیا بات ہے کہ انسانوں کی طرف سے انسانوں کے دل ڈرتے ہیں؟ کیا بات ہے کہ انسان انسان کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتا، بے خوف اور مطمئن نہیں ہوتا؟ اس کے اندر ڈر پیدا ہوتا

---

(۱) Guide to Modern Wickedness P. 261

ہے، اور وہ اس سے زیادہ ڈرتا ہے جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہے، جس کے پاس زیادہ ذخائر ہیں، یہ الٹی گنگا کیوں بہہ رہی ہے؟ یہ اس لیے بہہ رہی ہے کہ ہمارے پاس خدا کو خوش رکھنے اور اس کی مخلوق کی قدر اور اس سے محبت کرنے کا مادّہ نہیں ہے۔ رونا اس کا ہے کہ ذرائع صرف ضائع ہی نہیں ہو رہے ہیں؛ بلکہ انسان کشی میں صرف ہو رہے ہیں، انسانی تہذیب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔

ماہرین فن کی ضرورت

مدارس کا کام یہ ہے کہ وہ بتائیں کہ علم کا رشتہ کس سے جڑتا ہے؟ کس ذات سے جڑتا ہے؟ اس کا کیا منشا ہے؟ ہمارے فاضل دوست اے. یو. شیخ صاحب نے عربی داں اور فضلائے مدارس کے لیے ٹیکنیکل تعلیم کے حصول اور خود کفیل "Self Supporter" بننے کی ضرورت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے میں اس کی قدر کرتا ہوں اور اس کی ضرورت و افادیت سے انکار نہیں کرتا، مگر آپ علم و تمدن کی تاریخ پڑھیں، عقل و دانائی اور فلسفۂ اخلاقیات کی تاریخ پڑھیں، دنیا اور معاشرۂ انسانی کی اصلاح و انقلابی تحریکوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں، آپ کو معلوم ہوگا کہ کبھی دنیا ماہرین فن "Experts" سے بے نیاز نہیں رہی ہے، کوئی ملک، کوئی سوسائٹی، یونان سے لے کر یورپ و امریکہ تک، جنھوں نے سوسائٹی پر حکمرانی کی ہے، جنھوں نے علم و فلسفہ کو صحیح رخ دیا ہے اور جنھوں نے بہت سی خرابیوں کو دور کیا ہے، اور جنھوں نے عدل و انصاف کو نئی زندگی عطا کی ہے، وہ اکسپرٹس ہیں، اس لیے اکسپرٹس کا وجود ہر زمانہ میں ضروری ہے۔

ہمارے مدارس کے فضلاء باعزت ہنر کے ذریعہ اپنا پیٹ بھر لیں، میں اس کا مخالف نہیں؛ لیکن اس سے زیادہ ان کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ اکسپرٹس پیدا کریں، ہمارے ملک کو بھی ہمیشہ اکسپرٹس کی ضرورت رہے گی، یہ ملک صرف پروفیشنل لوگوں سے نہیں چل رہا ہے، اکسپرٹس سے چل رہا ہے، خواہ پالٹکس کے اکسپرٹس ہوں، اخلاقیات کے اکسپرٹس ہوں، ایجوکیشن کے اکسپرٹس ہوں، ایڈمنسٹریشن کے اکسپرٹس ہوں۔ اس لیے میں بغیر کسی معذرت

کے ایک بڑے ادارہ (ندوۃ العلماء) کے ناظم اور کئی ملکی اور غیر ملکی جامعات (Universities) کے رکن ہونے کے ناطے (اور جامعہ ہدایت کے ایک مشیر کار کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں) کہ ان مرکزی مدارس عربیہ کو علوم دینیہ میں، علوم لسانیہ میں، زبان وادب میں، صرف ونحو (Grammar) میں، عربی زبان کے لٹریچر میں، عقلیات میں اکسپرٹس پیدا کرنا ہے۔ جو ملک صرف ہنر مندر رکھتا ہے، جو صرف پیشہ ور رکھتا ہے، جہاں کا کوئی فرد بے کار نہ ہو، پورا ملک ایسے ہنر مندوں سے بھرا ہوا ہو، ملک کا ہر باشندہ اپنے ہنر سے اپنے خاندان کی پرورش کر سکتا ہو، وہ ملک اس وقت تک عزت نہیں پا سکتا ہے جب تک وہ اکسپرٹس کی ٹیم نہ دکھائے، دنیا کے سامنے پیش نہ کرے، جس سے یہ معلوم ہو کہ اس کے یہاں صاحب امتیاز اکسپرٹس موجود ہیں، قوم کی عزت محض چند پیٹ بھر لینے والوں سے نہیں ہے، زندہ اور آزاد قوموں کی عزت اعلیٰ دماغوں سے، اکسپرٹس، جینیس (Genius) لوگوں سے ہے۔ ہمیں کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ ہماری جدید وقدیم جامعات اکسپرٹس تیار کرنے کے لیے ہیں۔

صالح مقاصد کے لیے زندگیاں وقف کرنے کی ضرورت

دوسری بات یہ ہے کہ دنیا میں جو صالح ومفید انقلابات (Revolutions) ہوئے ہیں، ان کا سب سے بڑا کردار اور فیکٹر وہ انسان ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں کسی صالح و مفید مقصد کے لیے وقف کر دیں، جنھوں نے اپنی تمام مشغولیتیں اور دل چسپیاں اس کے لیے قربان کر دیں، وہ اگر مذہبی انسان تھے تو انھوں نے خدا سے انسانوں کا رشتہ جوڑنے، انسانیت کو پستی سے نکالنے کے لیے اور جہالت دور کرنے کے لیے، اور اگر وہ سیاسی لوگ تھے تو ملک کو آزاد کرانے کے لیے، اور اگر وہ سوشل ورکر (Social Workers) ہیں تو نابرابری اور ناانصافی دور کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ ہمارا ملک، ہمارا سماج؛ بلکہ اس وقت کی دنیا، پوری انسانی تہذیب اس وقت تک صحیح رخ پر نہیں جا سکتی اور اس وقت تک صحیح انقلاب نہیں آ سکتا، جب تک سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں وہ لوگ نہ ہوں جو خود اپنی زندگیاں وقف کریں، وہ اپنے گھر کو بے چراغ رکھیں گے مگر محلّہ کی روشنی کی فکر

کریں گے، پیٹ پر پتھر باندھیں گے تاکہ دوسرے گھروں کے بچے بھوکے نہ سوئیں، وہ راتوں کو جاگیں گے تاکہ لوگ آرام سے سوسکیں، ان کو چور اور کسی رہزن کا خوف نہ ہو۔

حضرات! حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے حکم سے اپنے ان ہی گنہگار ہاتھوں سے ۱۹۷۶ء میں اس جامعہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت تک مجھے زندہ رکھا کہ آج اس ادارہ وعمارت کے افتتاح کی سعادت وعزت حاصل کررہا ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں پوری تواضع وانکساری کے ساتھ یاد دلاؤں کہ وہ کس بلند مقصد کے تحت قائم کیا گیا ہے (اور وہ وہی ہے جو میں نے تفصیل سے عرض کیا)۔

آج جو مسلم پرسنل لا کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہورہے ہیں، جو اعتراضات کیے جارہے ہیں کہ اسلام میں عورت کا اسٹیٹس کیا ہے؟ اس مسئلہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی ذمہ دار عدالت "Supreme Court" نے اپنے فیصلہ کے شروع میں یہ کہہ دیا کہ اسلام میں عورت کا مقام بہت پست ہے۔ ہمارے اندر ایسے اکسپرٹس ہونے چاہئیں جو (کتاب وسنت) شریعت وفقہ، تاریخ اسلام اور تقابلی مطالعہ (Comparative Study) کی روشنی میں روز روشن کی طرح ثابت کریں کہ اسلام نے عورت کو وہ مقام دیا ہے، وہ حقوق اور مواقع عطا کیے ہیں جو کسی مذہب، فلسفہ، تہذیب اور معاشرہ نے ابھی تک عطا نہیں کیے۔ اس کے لیے ماہرین علوم شرعیہ، وسیع النظر فضلاء اور متبحر علماء کی ضرورت ہے، اور الحمدللہ وہ اس وقت بھی موجود ہیں، انھوں نے یہ چیلنج قبول کیا اور یہ فرض حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا۔

ہندوستان میں عربی زبان وادب کے ماہرین

ہمارے ملک نے ہر دور میں ایسے اکسپرٹس پیدا کیے جن کا پورے عالم عربی نے لوہا مان لیا۔ میں اس کی گواہی دیتا ہوں، آپ علامہ سید مرتضی زبیدی بلگرامی کا نام اگر کسی عرب حلقہ میں لیں تو ادب کے مارے سر جھک جائیں گے، وہ اودھ کے ایک قصبہ بلگرام کے رہنے والے تھے، انھوں نے بارہویں صدی میں ''تاج العروس'' کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھی جسے حال میں کویت کی حکومت نے ۲۱ جلدوں میں شائع کیا ہے، کہ عرب بھی اس کو نہیں پیش

کر سکتے ہیں، عربی زبان وادب کی ایسی نوک و پلک دیکھنے اور پرکھنے والا کسی عرب ملک میں پیدا نہیں ہوا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ علامہ عبدالعزیز میمنی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق صدر شعبۂ عربی)، عربی زبان وادب کے سب سے بڑے لغت ''لسان العرب'' کی تصحیح کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی، اس کے اہم رکن تھے، ہمیں اپنے اس ورثہ کو برقرار رکھنا چاہیے۔

پیام انسانیت کے کام کی ضرورت

آج بھی ہمارا ملک بڑے خطرہ سے دوچار ہے، میں اس موضوع پر زیادہ نہیں بولوں گا، میں اس پر بولتا رہتا ہوں، اور ہمارے بزرگ اور محترم جناب مولانا عبدالحی فائز صاحب نے اس تحریک کا نام لے کر میرے داغ کہن تازہ کردیے کہ میں ''پیام انسانیت'' کا بھی ایک ادنیٰ خادم اور اس کی پکار لگانے والا ہوں۔

آپ یہاں کے ٹیکنیکل ترقیات اور اٹمک کامیابیوں پر نہ جائیے، آپ اس پر بھی نہ جائیے کہ یہاں خواندگی کا تناسب کتنا بڑھا ہے؟ یہ ملک کرپشن کا مارا ہوا ہے، اس ملک کے رہنے والے اعتماد کھوتے چلے جارہے ہیں، جن کو اس کا خادم ہونا چاہیے، جن کو مددگار ہونا چاہیے، ان کا رشتہ اس ملک کے ساتھ گاہک اور سوداگر جیسا ہوگیا ہے۔

ہمارے مدارس کے طلبہ اور فضلاء کا کام یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو خدا سے ڈرائیں، انسانیت کا سبق پڑھائیں اور انسان کو انسان بننا سکھائیں، وہ اپنی قربانی سے، وہ اپنی سادہ زندگی سے، معمولی لباس اور معمولی کھانے سے نمونہ قائم کریں، اس ملک کے ساتھ محبت کرنا سکھائیں اور یہ بتائیں کہ ملک سخت خطرے سے دوچار ہے، اس ملک سے کرپشن دور نہ ہوا، ناانصافی دور نہ ہوئی، برادریوں کی نابرابری اور ہر معاملہ کو تنگ نظری سے دیکھنے اور حل کرنے کا سلسلہ ختم نہ ہوا تو یہ ملک جس کی بڑی شاندار تاریخ ہے، بڑا شاندار ماضی ہے، جس سے انسانی قوموں کی اور ملکوں کی بڑی توقعات ہیں، وہ زوال اور تباہی کا شکار ہوجائے گا۔

اس لیے ہمارے طلبہ اور فضلاء کو پیام انسانیت کا سبق دینا چاہیے، تعلیم یافتہ نوجوانوں کے سامنے سادگی اور جفاکشی اور تھوڑی چیز پر گزر بسر کرنے کا، دوسروں کو اپنے پر ترجیح دینے کا، دوسروں کے لیے تکلیف اٹھانے کا، دوسروں کی تکلیف سے آزردہ ہونے اور دوسروں کی

خوشی سے خوش ہونے کا نمونہ پیش کرنا چاہیے، یہ نمونہ خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا، نائبین رسول نے پیش کیا، پھر نام آتا ہے حضرت خواجہ اجمیریؒ کا۔

زباں پر بار خدا یہ کس کا نام آیا
کہ مرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

آخر میں اہل جے پور اور راجستھان اور ملک کی دوسری ریاستوں کے مخلصین کے خلوص و کمال اور خدمت و قربانی کی قدر دانی پر، جس کا اظہار انھوں نے جامعہ ہدایت کے بانی اور سرپرست اور جامعہ کے ساتھ کیا ہے، مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دراصل انسان اور ہنر و کمال کے درمیان، خدمت و خلوص اور انسان کے درمیاں ایک لازوال رشتہ ہے جو کبھی فنا ہونے والا نہیں ہے، دنیا اسی سے زندہ ہے۔ جس دن یہ رشتہ ختم ہوا خیر اور خیر کے ساتھ تعاون کرنے کے جذبہ کا رشتہ، تو دنیا ایک منڈی بن کر رہ جائے گی جہاں بقول اقبال۔

تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

میں ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کر رہا ہوں کہ اگر میں نے حدود سے تجاوز کیا ہے تو اس کی اپنے اللہ سے پہلے معافی مانگتا ہوں کہ اسی کی بارگاہ میں مجھے حساب و کتاب دینا ہے، اور اس کے بعد میں خدا کے بنائے ہوئے ان انسانوں کی خدمت میں معذرت پیش کرتا ہوں جنھوں نے میری گزارشات توجہ اور قدر دانی سے سنیں۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.(۱)

(۱) ۲۴-۲۵ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ مطابق ۸-۹ دسمبر ۱۹۸۵ء کو جامعہ ہدایت، جے پور (راجستھان) کے جشن افتتاح کے موقع پر موقر علماء، معززین شہر، مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے ممتاز مندوبین کی کثیر تعداد کے علاوہ مرکزی حکومت کے بعض وزراء، ریاست کی انتظامیہ کے ارکان، راجستھان ہائی کورٹ کے متعدد جج صاحبان، ماہرین تعلیم، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر، اور ممبئی کے مشہور تعلیمی ورفاہی امور کے ماہر کارکن ڈاکٹر اے۔ یو۔ شیخ وغیرہ کی موجودگی میں حضرت مولاناؒ نے (جنھوں نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اس ادارہ کا سنگ بنیاد رکھا تھا) یہ صدارتی تقریر فرمائی، جو بعد میں حضرت مولاناؒ کی نظر ثانی اور خفیف حذف و اضافہ کے بعد "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۵ء) میں شائع ہوئی۔

زبردست چیلنج

اور

دوررس نتائج کے حامل خطرات

قرآن مجید میں دینی مدارس کا تذکرہ

الحمدللّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی رسول اللّٰہ۔ أما بعد! فأعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً، فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ.﴾ (سورۃ التوبۃ:۱۲۲)

حضرات! اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا قرآن مجید میں مدارس دینیہ کا تذکرہ ہے؟ کیا ان کے فرائض اور واجبات کا ذکر ہے؟ تو میں کہوں گا کہ قیامت تک کے لیے اس آیت میں مدارس کے فرائض اور ذمہ داریوں کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ اس آیت میں مدارس کی ذمہ داری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ''ایسا کیوں نہیں ہوا کہ مومنوں کی ہر جماعت میں سے ایک جماعت دین میں سمجھ پیدا کرنے کے لیے گھروں سے نکل کھڑی ہوتی، تاکہ جب یہ لوگ دین سیکھ کر اور اس میں سمجھ پیدا کر کے اپنے ملک وقوم میں واپس جائیں تو انھیں عصر حاضر کے فتنوں سے ڈرائیں اور باخبر کریں، تاکہ ان کی قوم ان فتنوں

سے چوکنا ہوجائے اوران سے بچنے کی کوشش کرے۔'' حقیقت میں مدارس کا کام یہی ہے کہ وہ ایسے افراد تیار کریں جو اپنے زمانے کے نئے نئے فتنوں اورسازشوں سے واقف ہوں اوران کے مقابلہ کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔

صلیبی حملہ

حضرات! تاریخ کے ایک طالب اورمشرق ومغرب کوقریب سے دیکھنےاورایک تجربہ کارو واقف کار کی حیثیت سے میں عرض کرتاہوں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں دو بڑے عالم گیر خطرات پیدا ہوئے، ایک توصلیبی حملہ تھا، جس کا مقصد صرف بیت المقدس پر قبضہ کرنا نہ تھا، بلکہ ان کے پیش نظر حرمین شریفین پر قبضہ کرنا بھی تھا، اگر سلطان صلاح الدین ایوبی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو نہ کھڑا کیا ہوتا تو خدانخواستہ آج عالم اسلام کا وجود ختم ہوگیا ہوتا۔ایک مرد غیب پیدا ہوا، اس نے مسلمانوں کی منتشر طاقتوں کو یکجا کیا اور پوری قوت سے صلیبیوں پرضرب لگائی اوران کوایسی شکست دی کہ پھر دوبارہ عالم اسلام پر یورش کی جرأت انھیں نہ ہوسکی، اس یورش کے پیچھے کوئی دعوت وتحریک اورفلسفہ نہیں تھا۔

تاتاری یورش

دوسرا خطرہ تاتاری یورش کی صورت میں سامنے آیا۔تاتاری جیسی وحشی قوم نے عالم اسلام پرزبردست حملہ کیااوران کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ان کا نشانہ اگرچہ عراق، ایران اورترکستان تھے، اورانھوں نے انھیں پوری طرح تاراج کرکے رکھ دیا تھا، لیکن ان تاتاریوں کی ہیبت اورغیر معمولی دھاک دلوں پر ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ اس زمانہ میں یہ بات ضرب المثل بن گئی تھی: ''إِذَا قِيلَ لَكَ إِنَّ التَّتَرَقَدِ انْهَزَمُوا، فَلَا تُصَدِّقْ ''، اگر تم سے یہ کہا جائے کہ تاتاریوں کوشکست ہوگئی تواس بات پر یقین نہ کرنا، اس طرح کہاں عراق وایران اورکہاں انگلستان کا ساحل، مؤرخین نے لکھا ہے کہ تاتاریوں کی ہیبت سے انگلستان کے

ساحل پر مچھیرے عرصہ تک شکار کھیلنے نہیں نکلے، اس زمانہ میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ عالم اسلام سیاسی و مادی لحاظ سے ختم ہو جائے گا، ان کے حملہ کی نوعیت فوجی تھی، جسمانی اعتبار سے مسلمانوں کو قتل کرنا تھا، ان کی یورش کے ساتھ کوئی دعوت نہیں تھی، اور نہ کوئی فلسفہ اور تحریک اس کے پس پردہ کام کر رہی تھی اور نہ ہی کوئی کلچر اور تہذیب اور ثقافت کو غالب کرنے کا جذبہ ان تاتاریوں کے اندر کار فرما تھا، اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کو بھی ختم کرنے کے لیے مصری جنرل الظاہر بیبرس کو کھڑا کیا جس نے تاتاریوں کو شکست فاش دی، اور وہ بے اثر ہو کر رہ گئے، روحانی اعتبار سے بھی اسلام کی دعوت نے اس پوری قوم کو مسخر کر لیا۔

عصر حاضر کے چیلنجز اور خطرات

حضرات! لیکن آج کے دور میں جو زبردست چیلنج اور غیر معمولی دور رس اثرات و نتائج کے حامل خطرات ہیں، وہ پہلے دو خطرات اور چیلنجوں سے کہیں زیادہ سنگین حد تک مضر اور نقصان دہ ہیں، آج جدید تعلیم یافتہ اور حکمراں طبقہ کے دل و دماغ میں یہ بات پوری طرح راسخ کرنے کی کوشش سیاست واقتدار اور صحافت کے ذریعہ کی جارہی ہے کہ آج کے دور میں اسلام کا کوئی کردار نہیں، اس ترقی یافتہ سائنسی دور میں اسلام کا کوئی پیغام نہیں، وہ ایک پرانی یادگار ہے، وہ جدید دور کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کی آج کوئی ضرورت نہیں، اس نے ایک زمانہ میں اچھا کردار ادا کیا تھا، اس نے دختر کشی ختم کر دی تھی، علم کو اس نے فروغ دینے میں بڑا رول ادا کیا تھا، قدیم یہودی اور عیسائی مذاہب کی طرح اسلام بھی ایک بے جان مذہب ہے۔

عالم اسلام کے خلاف تمام سازشوں کا مرکز اسرائیل

اس وقت یورپ و امریکہ کی پوری طاقت اسی پر صرف ہو رہی ہے، آج اسرائیل کی موروثی و نسلی ذہانت و شطارت (چالاکی، اس میں تخریبی ذہانت بھی شامل ہے) اور امریکی

وسائل وذرائع، اس کی اعانت اور اثر ونفوذ سب اس بات پر صرف ہورہے ہیں کہ عالم اسلام کے تمام ممالک حتی کہ حرمین شریفین بھی اس سازش کا شکار ہوجائیں۔ ان مغربی طاقتوں نے عالم اسلام کے حکمرانوں اور وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ پوری طرح باور کرادیا ہے کہ اس وقت سیکولرزم اور قوم پرستی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے، مغرب کی مکمل تقلید ہی میں ان کی ترقی اور کامیابی مضمر ہے، یہ اتنا خطرناک اور عالم اسلام کے خلاف اتنی گہری سازش ہے کہ اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اس کے دوررس اثرات ونتائج کا اندازہ کرنے سے راتوں کی نینداڑ جاتی ہے۔ نشر واشاعت کے تمام ذرائع کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مادی اثر ونفوذ کو بھی استعمال کیا جارہا ہے، ہمارے پاس اس کے دلائل وشواہد ہیں کہ ان تمام سازشوں کا مرکز اسرائیل ہے اور وہی اس کی قیادت کررہا ہے۔ اس زبردست فتنہ کا مقابلہ مدارس دینیہ ہی کرسکتے ہیں۔

مدارس دینیہ کا کام

حضرات! مدارس دینیہ کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ نصابی کتابیں سمجھ لی جائیں، اور مسئلے مسائل بتادیے جائیں، ہم ان کی ناقدری نہیں کرتے، اس نظام تعلیم کا ہم احترام کرتے ہیں، لیکن صرف اتنا کافی نہیں، موجودہ فتنوں کو سمجھنا، ان سے اچھی طرح باخبر ہونا اور ان کا مؤثر وطاقتور زبان اور دلکش اسلوب میں مقابلہ کرنا وقت کا بنیادی تقاضا ہے۔ ہمارے طلبہ واساتذہ عربی زبان میں مہارت پیدا کریں، انگریزی زبان میں کمال پیدا کریں، اور ایسا لٹریچر تیار کریں جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو متأثر کرسکے، ہمارے اساتذہ اور طلبہ کا مطالعہ وسیع، متنوع اور اپٹوڈیٹ (Up to date) ہو، ندوۃ العلماء نے عرب قوم پرستی کے خلاف جو زبردست محاذ قائم کیا تھا اور اس کے فرزندوں نے جس طرح پوری تیاری اور قوت کے ساتھ طاقتور اور مؤثر اسلوب میں اس فتنہ پر ضرب کاری لگائی تھی، اس کا عام طور پر عالم عربی میں اعتراف کیا گیا۔

زندگی اور موت کا محاذ

حضرات! آپ نے طویل سفر کر کے یہاں آنے کی زحمت کی ہے، آپ نے اتنا طویل سفر کر کے یہاں آ کر غلطی نہیں کی، آپ ایسے مرکز میں آئے ہیں جس نے دین کی خدمت کا ایک گوشہ سنبھال رکھا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ ندوی فرزند عرب ممالک کو اپنی طاقتور تحریروں سے متاثر کر سکتے ہیں، انھوں نے عرب قومیت کے فتنہ کے خلاف جو آواز اٹھائی تھی وہ رائیگاں نہیں گئی، اس وقت بھی ندوۃ العلماء ایسے محاذ پر کھڑا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے موت وزندگی کا محاذ ہے، اس وقت تمام مغربی طاقتوں کی یہ زبردست کوشش اور سازش ہے کہ اسلام کسی طرح گوشہ نشین ہو کر رہ جائے، وہ قصۂ ماضی کی طرح بن جائے، زندگی سے سارے رشتے اس کے ختم ہو جائیں، اس وقت اس فتنے کے خلاف صف آرا ہونے کی ضرورت ہے، یہ اہم ترین اور مفید ترین محاذ ہے، یہ اسلام کی زندگی اور موت کا محاذ ہے، اسی محاذ پر ندوۃ العلماء کھڑا ہے۔ (۱)

(۱) ۳۰/صفر ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۷/جولائی ۱۹۹۶ء کو ندوۃ العلماء کے جلسۂ انتظامی کے موقع پر کی گئی ایک مختصر اور چشم کشا تقریر، ماخوذ از پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، لکھنؤ، شمارہ ۲۵/جولائی ۱۹۹۶ء۔

اسلام کی حیات وبقا کے لیے مسلمانوں پر ذمہ داری

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل واحسان ہے کہ اس نے ہندوستان کو دینی علوم اور دین کی جدوجہد اور کوشش کے لیے انتخاب فرمایا، یہاں بڑے بڑے دین کے داعی، اہل اللہ، اہل قلوب، مبلغین پیدا ہوئے، انھوں نے قرآن وحدیث کا گہرا علم حاصل کیا، اس کی تعلیمات کو سینہ سے لگائے رکھا، اور ان کے مقابل جاہلیت، وحدۃ الوجود، مادہ پرستی اور ہندوستانی فلسفوں و تہذیبوں کی جو طاقتیں بھی آئیں، ان کا انھوں نے انتہائی ثابت قدمی واستقلال سے مقابلہ کیا جس کی مثال دنیا کے وسیع خطہ میں نہیں ملتی۔

اسلام سے ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام، اسلامی تعلیمات، رسول پاک (ﷺ) کی ذات گرامی سے، آپ کے لائے ہوئے طریقہ اور مسلک، وطن، آپ (ﷺ) کی ارشاد فرمائی ہوئی حدیثوں سے، آپ کے طریقہ اور مسلک زندگی سے، جتنا تعلق ہندوستانی مسلمانوں کو ہے اتنا عرب ممالک کو بھی نہیں، اب بھی عربوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی رقیق القلبی، دینی ذوق اور اسلام کے ساتھ وفاداری کا احساس ہے، میں نے خود عربوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہندوستانی لوگ نہ عربی زبان جانیں نہ عربی سے آشنا ہیں، لیکن اس کے باوجود انھیں اسلام سے گہرا تعلق ورشتہ کیوں ہے؟ اسی وجہ سے کہا گیا ہے قرآن مکہ میں نازل ہوا، مغرب اقصیٰ میں حفظ کیا گیا، ترکی میں لکھا گیا، مصر میں پڑھا گیا، اور ہندوستان میں سمجھا گیا۔

اسلام سے تعلق کے اسباب

اگر ہم ہندوستان کی تاریخ پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ کچھ خصوصیات ہیں جو اسلام سے ان کے اس تعلق کا سبب ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی اسلام سے تعلق کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب وہ ہندوستان میں آئے تو ان کی مثال ایسی تھی جیسا کہ ۳۲ دانتوں کے درمیان زبان یا بحر ظلمات میں منارہ کی، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، جب کسی کے مقابل ایسی طاقتیں ہوں جن سے ڈر ہو کہ وہ اس کو فنا کردیں گی، اس کا وجود مٹا دیں گی تو پھر اس میں مقابلہ کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں نے بھی ہندوستان میں جب اپنے آپ کو ان طاقتوں کے مقابل پایا تو انھیں خطرہ پیدا ہوا کہ ان کے پاس جو اسلام کے سرمایہ کی بیش بہا دولت ہے، اگر اس کی حفاظت نہ کی گئی تو یہاں کی طاقتیں اسے نیست و نابود کردیں گی، اس خیال نے انھیں اسلام کی حفاظت کرنے پر مجبور کردیا، انھوں نے اسلام کو سینہ سے لگایا، اور جب انھوں نے اس طرح اسلام کو گلے سے لگایا تو خدا کا فضل و انعام ان پر ہوا، اور اس کی مہربانی ان پر سایہ فگن رہی، وہ ہمیشہ بلا کسی دقت و دشواری کے بیت اللہ جا سکتے تھے، رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے روضہ پر حاضری دے سکتے تھے۔

ہندوستان میں فیض و افادہ کے بادل

جب بھی دنیا میں کوئی بڑا فتنہ آیا، یورش ہوئی، جیسے کہ تاتاریوں نے دنیا میں ایک تہلکہ مچادیا تھا، تو اس وقت بڑے بڑے باصلاحیت، ذہین خاندان جن میں اسلامی عزت اور قوت عملی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، ہندوستان میں آ کر مختلف وقتوں میں پناہ لیتے رہے، تاتاریوں کے حملے کے وقت سر چھپانے کی جگہ نہ تھی، اس وقت دنیا کا جوہر ہندوستان آ گیا، مصر و شام کو چھوڑیے، عراق، ایران، افغانستان کا کوئی بڑا عالم و عارف ایسا نہ تھا جو ہجرت کر کے ہندوستان نہ آ گیا ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں علماء، زاہدین و صوفیاء کا ایک بڑا خزانہ جمع ہوگیا، سمرقند و بخارا کا جوہر ہندوستان آ گیا، یہاں کے سلاطین نے — جو علم کے

جو یا، علماء کے قدردان، معرفت وحکمت کے متوالے تھے۔ ان علماء کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ارباب حق وصفا کا کردار

ہندوستان کی سرزمین پر اہل قلوب کی خاص توجہ رہی، کچھ تو باہر سے آئے اور کچھ کو اس سرزمین نے پیدا کیا، ان اہل اللہ نے اسلام کی بقا اور اس کی تبلیغ واشاعت کے لیے بھرپور کوشش کی، وہ سپر بن گئے اور ہر قسم کے خطرات کا دلیری اور اولوالعزمی سے مقابلہ کیا، انھوں نے بادشاہوں اور سلاطین کے سبز باغ کو فراموش کر کے اسلام کے چراغ کو بجھنے نہ دیا، اور یہ اللہ کے بندے کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوئے، انھوں نے اپنی جگہ جنبش نہ کی، بلکہ اپنی روش پر انتہائی ثبات واستقامت کے ساتھ جمے رہے، اور درس وتدریس اور فیض پہنچانے کا کام کرتے رہے، دین کی امانت کو سینہ سے لگائے رہے، اور ایک ایسی جماعت تیار کرتے رہے جو اس امانت کی حفاظت کرتی رہے، اور روحانی تنظیم وتربیت کے ساتھ ساتھ انھوں نے جب بھی ضرورت پڑی حکومت کو نیا خون دیا، اسے ہمیشہ توانائی عطا کی، معاشرہ جب جب بھی گرنے لگا انھوں نے اسے سنبھالا۔

مردم سازی کے کارخانے

انھوں نے قاضی، وزیر، محتسب تیار کیے، جو حکومت کی اہم ذمہ داریاں سنبھالتے تھے، اس طرح مردم سازی اور آدم گری کا کام بھی کرتے رہے، آدمیوں کے سکے ڈھالتے رہے، کھرا دخالص سونا تیار کرتے رہے، ان کے یہاں ہر قسم کا آدمی ڈھلتا تھا، تازہ دم اور بہادر سپاہی پیدا ہوتے تھے، محمد تغلق کے انتقال کے بعد جب حالات انتہائی دگرگوں تھے، تاتاریوں کی یورش کا خطرہ تھا، دولا کھ ٹڈی دل لشکر مقابلہ میں تھا، فیروز تغلق حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار نہ تھا، اگر اس وقت فیروز تغلق سریر مملکت پر نہ بیٹھتا تو انتہائی خطرات کا اندیشہ تھا، ہوسکتا تھا کہ آج ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا، اس وقت نظام الدین اولیاءؒ نے فیروز تغلق سے کہا: تم تخت سلطنت پر بیٹھتے ہو یا میں اللہ تعالیٰ سے کسی

دوسرے کو مانگوں؟ اگر تم سریر مملکت پر بیٹھتے ہو تو میں تمہارے لیے خدا سے صلاح وفلاح مانگوں گا۔ تاریخ فیروز شاہی میں ہے کہ فیروز تغلق تیار ہو گیا، اور بیس سال اس نے انتہائی شان وشوکت سے حکومت کی، اس کا زمانہ سنہری زمانہ کہا جاتا ہے، پوری مملکت میں نہ کہیں انتشار و پراگندگی تھی، اور نہ لوٹ کھسوٹ، نہ فسق وفجور تھا، نہ فحاشی و بدکاری تھی، وہ علم اور علماء کا حد درجہ قدرداں تھا، اسے اپنے یہاں علماء کی موجودگی پر فخر ہوتا تھا، جس طرح بادشاہوں کو فتوحات، عمارتوں کا شوق ہوتا تھا، اسی طرح وہ آپس میں ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے کہ ہمارے یہاں اتنا بڑا عالم ہے، اگر کوئی عالم باہر سے آتا تو اس کی عزت کرتے، بڑے سے بڑا اسے منصب عطا کرتے، اور ہر طرح اس کی دل جوئی کی کوشش کرتے تھے۔

مدارس کا فیض

اس زمانے میں نصاب تعلیم ایک ہی تھا، جس سے دینی امور اور سلطنت کے عہدوں کے لیے لوگ تیار ہوتے تھے، بڑے بڑے مدرسے قائم کرنے کا شوق تھا، ان مدارس کے لیے جاگیریں وقف ہوتیں، اور انہی مدارس سے ایسے جید علماء پیدا ہوتے جن کا صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں لوہا مانا جاتا تھا، یہ سلسلہ ہندوستان میں جاری رہا، ان مدارس سے جو لوگ فراغت حاصل کرتے وہ یا تو درس وتدریس کا سلسلہ قائم کرتے یا پھر بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہوتے۔

ہندوستان کے علماء کی لکھی ہوئی کتابیں دوسرے ملکوں میں پھیلتی رہیں، اور مختلف موضوعات اور علوم پر ضرورت کے مطابق کتابیں تصنیف کی جاتی رہیں، ہندوستانی علماء ان تمام علوم کو قبول کرتے رہے اور اپنے نصاب میں انھیں جگہ دیتے رہے جو کہ دوسرے ممالک میں پھیلے یا جن کی ضرورت ہوئی، جن علوم کا بھی سکہ ہوا اسے انھوں نے قبول کیا، اس طرح یہاں کا نصاب ارتقاء سے گزرتا رہا، حالات اور ضروریات کے تحت اس میں تبدیلی ہوتی رہی اور یہ نظام چلتا رہا، لیکن جب اسلامی سلطنت میں ضعف آیا اور یہ ضعف روز افزوں بڑھتا ہی گیا اور بڑے بڑے لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب یہ ضعف ختم نہیں ہوسکتا، ابن خلدون نے لکھا

ہے کہ جب کوئی سلطنت بوڑھی ہو جاتی ہے تو پھر اسے جوان نہیں بنایا جا سکتا، مگر جب یہ نظر آنے لگا کہ ہندوستان کی سلطنت بوڑھی ہو گئی ہے، اس میں جینیس (عبقری) افراد پیدا نہیں ہو رہے ہیں، تو اس وقت کے علماء میں سے کچھ ایسے ہوئے جنھوں نے سیاست پر گہرا اثر ڈالا، انھوں نے اسلام کے سیاسی و اقتصادی حالات بیان کیے، ان لوگوں میں سرفہرست شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا نام ہے، جنھوں نے ملکی سیاست پر گہرا اثر ڈالا، معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کیں، اور اقتصادیات کے باریک مسائل کو نہایت مہارت کے ساتھ پیش کیا، انھوں بتلایا کہ بادشاہ کو کیا ہونا چاہیے، بادشاہ اور رعایا کے درمیان کس طرح کے تعلقات ہونا چاہئیں، اور بادشاہ کے کیا کیا اوصاف ہوں وغیرہ وغیرہ۔

اور جب شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دیکھا کہ مرہٹے ایک عظیم طاقت بن کر ابھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستان پر چھا گئے ہیں، تو انھیں اسلام اور سلطنت اسلام سخت خطرے میں معلوم ہوئی، انھوں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی جس نے آکر مرہٹوں کا زور توڑا، جب علماء نے دیکھا کہ سلطنت کا ضعف دور ہی نہیں ہوتا تو انھوں نے چاہا کہ صاحب استقامت، جری، شجاع اور اولوالعزم لوگوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو اسلام کی حفاظت کا کام انجام دے، اور اگر مسلمان سلطنت سے محروم بھی ہو جائیں تب بھی اسلام یہاں سے نہیں مٹے، اور یہ لوگ اسلام کی حفاظت اور مستقبل کو سنہرا اور بہتر بنانے کی کوشش کریں، پھر وہ علماء کی ایسی جماعت پیدا کرنے میں مصروف ہو گئے۔

خدا کو یہ منظور ہوا کہ مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ گل ہوا ور انگریز یہاں کا نظام سنبھالیں، اور ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے بعد انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے، انگریزوں کے برسر اقتدار آ جانے سے اسلامی تہذیب کے لیے بہت بڑا خطرہ درپیش ہو گیا، اگر انگریزوں کے علاوہ کوئی دوسرا برسر اقتدار آتا تو اتنا بڑا خطرہ نہ ہوتا لیکن انگریز جو زندگی کا ایک معیار، نیا اقتدار، نیا فلسفہ، نئی زندگی، نئی سائنس، نئے علوم اور زبردست و ہمہ گیر مادیت لے کر آئے تھے، جن سے مسلمانوں کو زبردست خطرہ پیدا ہوا اور اسلام کی بقا کی فکر دامن گیر ہوئی۔

قیام دارالعلوم دیو بند

پہلے علماء نے ایک ایسی جماعت تیار کردی تھی جو سلطنت کے ختم ہونے کے بعد بھی اسلام اور تعلیمات اسلام کی حفاظت کر سکے، اس جماعت نے اسلام کی حفاظت، اسلامی تعلیمات کی بقا کے لیے مدارس کی بنیاد رکھی، ان لوگوں نے انگریزی تہذیب اور انگریزی تعلیم سے اجتناب وانحراف کیا، اور انگریزی تہذیب کا مقابلہ کیا، اور حفاظت دین کی خاطر ہی ہندوستان کے طول وعرض میں مدارس اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا، دارالعلوم دیو بند، ندوۃ العلماء، تاج المساجد اور دیگر مدارس اسی تخیل کے تحت قائم کیے گئے اور اب تک اسی تخیل کے ساتھ قائم کیے جارہے ہیں۔

دین واسلام کی پناہ گاہیں

یہی مدارس ہیں جو اس وقت دین کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہیں، آج سرکاری نصاب تعلیم وقت کا سب سے بڑا خطرہ ہے، ہمارے بچوں کے دل ودماغ میں ہندورسم ورواج کو جاگزیں کیا جارہا ہے، یوپی، بہار، مالوہ اور مدھیہ پردیش میں اس کے اثرات زیادہ مضر پڑ رہے ہیں، اس مسئلہ میں بھی یہ دینی مدارس ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں، اس لیے آپ حضرات ان مدارس کی قدر کیجیے، ایسے اداروں کی قدر کیجیے، ان کی اپنی مقدور بھر مدد کیجیے، ان کے ساتھ امکان بھر تعاون کیجیے، اور جو رائج وجائز طریقے ہیں انھیں اپنائیے کیونکہ خدا کا فرمان ہے:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾[سورة إبراهيم:۷].(۱)

---

(۱) تاج المساجد، بھوپال میں ۱۹۶۷ء میں کی گئی ایک تقریر، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ، (شمارہ ۱۰/ستمبر ۱۹۸۵ء)۔

مدارس ومکاتب کا قیام

سب سے ضروری چیز

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد!

فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم. ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ [سورة آل عمران: ١٦٤]

انسانی آبادی کی دو اہم ضرورتیں

بزرگو، دوستو، بھائیو اور عزیزو!

آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ ہر آباد شہر کی جہاں انسانوں کی آبادی ہو، دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، اور ان دونوں چیزوں سے کوئی متمدن اور محفوظ و وسیع اور آباد شہر خالی نہیں ہے، ایک شفا خانے دوسرے تھانے، اس لیے کہ انسان کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں اور انسان کی جو کمزوریاں ہیں وہ دو قسم کی ہیں: ایک تو بیماریاں جو انسانوں کے ساتھ لگی ہوتی ہیں، ان سے اللہ بچائے تو انسان بچ سکتا ہے، ورنہ کوئی ان سے نہ بچا ہے اور نہ عام طور سے کوئی بچتا ہے، یہاں تک کہ پیغمبروں کو، اولیاء اللہ کو بھی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں، تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں اور اس کے لیے کوئی معذرت یا توبہ کی ضرورت نہیں، بڑے سے بڑے اللہ کے ولی کے حالات پڑھیں تو آپ کی نظر سے گزرے گا کہ ان کو فلاں تکلیف ہوگئی تھی اور ان کو فلاں قسم کی بیماریاں لاحق ہوئیں پھر اللہ نے شفا دی اور اللہ نے ان کو جسمانی شفا دی، اور لوگوں کو ان سے روحانی شفا ملی، ایسے ہی پیغمبروں کے

بارے میں بھی ہے، سید الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ (ﷺ) کے بارے میں بھی ہے، آپ کو ان کی سیرت میں مل سکتا ہے کہ کبھی کبھی آپ کو کتنی تکلیفیں ہوئیں، اور آپ نے دوا علاج کرنے کی ہدایت بھی فرمائی ہے، صحابہ کرامؓ کا کیا ذکر ہے، وہ بیمار ہوتے تھے، اچھے ہوتے تھے، اور صحیح ہوتے تھے۔ اس لیے ضرورت ہے شفاخانوں کی، یہ ایک انسانی، تمدنی، قدرتی اور فطری ضرورت ہے۔

دوسرے پھر انسانوں کی بیماری ہے کہ وہ جرم کرتے ہیں، کوئی چوری کرتا ہے، کوئی ڈاکہ ڈالتا ہے، رہزنی کرتا ہے، کوئی کسی کو مارتا ہے، اور کوئی کسی پر ہاتھ اٹھاتا ہے، زدوکوب کرتا ہے اور کبھی اس سے آگے بڑھ کر کشت وخون کی نوبت آجاتی ہے، اس لیے تھانے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ دو انسٹیٹیوشن (Institution) ہیں، دو قسم کے ادارے ہیں، ان کی ضرورت سب کو تسلیم ہے، اور سب ان کو ضروری سمجھتے ہیں، شہر کے لیے، انسانوں کی آبادی کے لیے۔

جہالت

لیکن ایک تیسری چیز ہے جس کی طرف سب کو توجہ نہیں ہے، اور وہ ان دونوں سے زیادہ خطرناک ہے، وہ ہے: جہالت، یعنی آدمی اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ پہچانے، اس کی صفات کو نہ جانے، اور اس کی قدرت سے، اس کی قہاری سے، اس کی جباری سے، اور اس کے رحم ومہربانی سے اچھی طرح واقف نہ ہو، اس کی ذات سے، صفات ومبادی سے وہ واقف نہ ہو، اور وہ اس کے سوا کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکائے، کوئی پتھر کے سامنے سر جھکا رہا ہے، کوئی درختوں کے سامنے سر جھکا رہا ہے، کوئی جانوروں کے سامنے سر جھکا رہا ہے، تو سب سے بڑی بیماری بلکہ سب سے بڑا جرم کہیے وہ جہالت ہے۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آنحضرت (ﷺ)، اللہ کے محبوب ترین اور عظیم ترین پیغمبر کی بعثت جس زمانہ میں ہوئی اس میں ہزار عیب تھے، بت پرستی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی، یہاں تک کہ جو چیز اپنے ہاتھ سے لے جاتے تھے، مٹھائی وغیرہ یا کوئی ایسی چیز اس تک کی عبادت کرنے لگتے تھے، جیسا کہ سیرت سے معلوم ہوتا ہے، باقی دوسری چیزوں کا کیا

ذکر ہے، بیت اللہ شریف میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ تو ایک طرف تو بت پرستی تھی، دوسری طرف ظلم کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی کے گھر لڑکی پیدا ہوگئی تو انھیں فکر ہو جاتی تھی کہ اب اس کے بعد اس کی شادی کرنی ہوگی، اس کی حفاظت کرنی پڑے گی اور اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنی ہوگی، اس پر خرچ کرنا ہوگا، داماد آئے گا، وہ ہمارے فرزندوں اور بیٹوں کی طرح اپنا حق سمجھے گا، اور کئی ذمہ داریاں عائد ہوں گی، سب کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں لڑکیاں زندہ درگور کی جاتی تھیں، زبان سے کہنا بھی مشکل دیتا ہے لیکن کیا کریں، عربی میں اس کو "وأد البنات" کہتے ہیں، قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

قافلہ کہیں سے مال لے کر چلا جا رہا ہے یا ذاتی سامان لایا ہے، اس پر ایک قبیلہ نے ڈاکہ ڈالا، حملہ کر دیا، اسی طرح دوسرے قبائل میں آپس میں جنگ ہوتی تھی، اس کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ عرب شاعر کہتا ہے کہ جب میرے گھوڑے کی پیٹھ بیٹھنے کے قابل ہو جائے اور چلنے کے قابل ہو جائے، تو خدا قبیلوں میں جنگ چھیڑ دے تا کہ کچھ مزہ آئے اور اپنے گھوڑے سے کام لینے کا وقت آئے۔

اسی طریقہ سے پچاس قسم کے عیب ان کے اندر تھے، اس سے آپ سبق لیجیے کہ اس دور کا نام "جاہلیت" رکھا گیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس زمانہ کی مذمت کرنے کے لیے، اور اس زمانے کے عیب کو ظاہر کرنے کے لیے، اور اس جیسے زمانے سے ڈرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عربی جیسی فصیح زبان میں اس عہد کا نام "جاہلیت" رکھا، یہ کہا ہوتا کہ 'بت پرستی' کا زمانہ، یہ کہا ہوتا کہ 'کشت وخون کا زمانہ'، یا یہ کہا ہوتا 'ظلم و زیادتی کا زمانہ' یا 'خانہ جنگی کا زمانہ'، لیکن قرآن شریف میں اس عہد کا نام "جاہلیت" آیا ہے، تین آیتیں تو مجھے یاد ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۱- ﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ [سورة الأحزاب:٣٣]

۲- ﴿إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ [الفتح:٢٦]

۳- ﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ﴾ [سورة المائدة:٥٠]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں "جاہلیت" کا لفظ استعمال کیا ہے، ہم قرآن شریف پڑھتے

ہیں گزر جاتے ہیں، ہمیں خیال نہیں آتا، الفاظ کا انتخاب یہ بڑی اہم چیز ہوتی ہے، جس کو مصنف وادیب، محققین اور بڑے وسیع النظر لوگ اور اعلیٰ درجہ کے زبان داں جانتے ہیں کہ کسی چیز کے لیے کسی لفظ کا اگر انتخاب کیا جاتا ہے تو اگر وہ آدمی حقیقت شناس ہے، نبض شناس ہے، اور زبان پر اس کو پوری قدرت ہے، تو وہ ایسا لفظ انتخاب کرتا ہے جو اس کی پوری تصویر کھینچ دے، اور اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی حقارت پیدا ہو، تو ایسا لفظ لاتا ہے کہ اس سے حقارت پیدا ہو جائے، اگر تعریف کرنا چاہتا ہے تو ایسا لفظ لاتا ہے جس سے اس کی عظمت پیدا ہو، عزت پیدا ہو، اور اللہ تعالیٰ زبانوں کا، الفاظ کا خالق ہے، معانی وحقائق کا خالق ہے، اور ادیبوں، شاعروں اور بڑے بڑے اہل کمال کا خالق، وہ اس عیب کو کسی اور لفظ سے تعبیر کرسکتا تھا، لیکن دیکھیے یہ ہم کو سبق دیا گیا ہے کہ ہمیشہ ہم جہالت سے ڈریں، کہ وہ زمانہ جو کہ باقی رہنے کے قابل نہیں تھا، خدا جانے کس وقت اللہ کا اس پر عذاب آجاتا، اللہ تعالیٰ نے بڑا رحم وکرم فرمایا، انسانیت پر رحم فرمایا کہ عرب کے اس دور میں اللہ نے اپنے سب سے محبوب، سب سے بڑے پیغمبر کو پیدا کیا، لیکن اس زمانہ کا جب ذکر آتا ہے، اور قرآن میں اس کی صفت آتی ہے تو ''جاہلیت'' کے لفظ سے آتی ہے۔

میں نے آپ کے سامنے یہ آیتیں پیش کیں: ﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ (دیکھو عورتو! تم اس طرح بے حجاب اور بے پردہ نہ پھرو جس طرح جاہلیت اولیٰ میں ہوا کرتا تھا)، ﴿إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ (جب کہ لوگوں نے اپنے دل میں جھوٹی غیرت اور خواہ مخواہ کی خودداری پیدا کی جو جاہلیت اولیٰ کی تھی)، ﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ﴾ اللہ نے بڑے جلال سے ارشاد فرمایا ہے: ''یہ اسلام کے قانون کو نہیں مانتے اور شریعت کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتے تو کیا یہ لوگ جاہلیت کے فیصلہ کو چاہتے ہیں؟'' یہاں پر دیکھیے! اس غصہ کا اظہار کرنے کے لیے کتنا سخت لفظ آنا چاہیے تھا، مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں اور قرآن کریم کی زبان میں جہالت اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کو ''جاہلیت'' کہا گیا۔

شفاخانوں اور تھانوں کی ضرورت

بیشک ہم شفاخانوں کی ضرورت واہمیت کا انکار نہیں کر سکتے، شفاخانے انسانی ضرورت کی تکمیل کا سامان ہیں، انسانوں کی زندگی بڑی قیمتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل بھی ہے اور دنیا کی ضرورت بھی ہے کہ انسان تندرست رہے، کام کرے، محنت کرے، اس لیے شفاخانے ضروری ہیں، اور ذرا شرم کے ساتھ کہنا پڑتا ہے بلکہ سر جھکا کر کہنا پڑتا ہے اور معذرت کے ساتھ کہ تھانے بھی ضروری ہیں، بڑے عیب کی بات ہے اور یہ زندگی کا بہت بڑا نقص اور بہت بڑا خلا ہے، بلکہ یہ سمجھئے کہ زندگی اور انسانی شرافت پر ایک دھبہّ ہے کہ تھانوں کی ضرورت بھی ہو، لیکن کیا کیا جائے، انسان کی فطرت ہے کہ اس سے غلطی ہو جاتی ہے اور وہ حد سے بڑھ جاتا ہے، اور دوسروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے، کسی کو چوری کی لت پڑ جاتی ہے، اور کسی کا ظلم کرنے کا مزاج بن جاتا ہے اور پھر اس سے اس کا ہاتھ بڑھ جاتا ہے، ویسے یہ چیزیں بُری ہیں، لیکن یہ انسان کی زندگی کا خاصہّ ہیں، کوئی زمانہ اس سے بچا نہیں ہے، ہاں! یہ ہوا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے ہدایت پھیلائی، یعنی جہاں علم کی دولت عطا فرمائی، علم کے خزانے جہاں پیدا کیے، علم کے شفاخانے جہاں بنوائے، اور جہالت کے مارے ہوئے لوگوں سے جو قصور ہوتے ہیں ان کے لیے تھانے بھی بنوائے، لیکن وہ تھانے کیسے ہیں؟ وہ تھانے ایسے نہیں ہیں کہ جرم ہو جائے تو پھر اس کو سزا دیں بلکہ وہ جرم کا جذبہ اور جرم کا شوق اور جرم کی جو اس میں کشش ہے، اور اس میں جو انسانی ضروریات کے فائدے ہیں، ان کو نظر سے گرائیں اور اس کی نوبت بھی نہ آنے دیں، اس لیے یہ جو دینی مدارس ہیں یہ انسانی ضروریات کی ایک اہم ترین ضرورت ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ شفاخانے تھانوں سے بھی زیادہ ضروری ہیں، تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا، اس لیے کہ انسان اگر آیا ہے تو اس دنیا سے جائے گا، اور اگر کوئی بیمار (اللہ تعالیٰ سب مریضوں کو شفا عطا فرمائے) ہو جاتا ہے تو اس کو علاج بھی کرانا ہوگا، تو یہ شفاخانے انسانی ضروریات میں سے ہیں، اور اسی وجہ سے مجبوری کی بنا پر تھانے بھی ضروری ہیں۔

دل، دماغ اور روح کا شفاخانہ

لیکن یہ دونوں اپنا کام پورا نہیں کر سکتے جب تک کہ ایک تیسرا شفاخانہ جو روح کا

شفا خانہ ہے اور دماغ کا شفا خانہ ہے، دل کا شفا خانہ ہے، اور اعمال انسانی اور اخلاق کا شفا خانہ ہے، وہ جب تک قائم نہ ہو تو یہ دونوں چیزیں مفید نہیں، اس لیے کہ اگر شفا خانوں میں احتیاط نہ ہونے کی بنا پر، علاج نہ ہونے کی بنا پر مریض بڑھیں گے، مرض بڑھے گا، تو تھانوں میں مجرم، چور، ڈاکو، رہزن اور ظلم وتشدد کرنے والے بڑھیں گے۔

اس طرح اگر مدارس قائم نہ ہوتے تو سب سے بڑا خطرہ جو انسان کے لیے ہو سکتا ہے ہلاکت ہے، خودکشی ہے، خودکشی کہیے اس کو، کہ وہاں تو غیر کشی ہوتی ہے، دشمن کشی ہوتی ہے، حریف کشی ہوتی ہے، اور یہاں خودکشی ہوتی ہے، وہ خودکشی کیا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کو نہ پہچانے، اس کی صفات کو نہ جانے، وہ ایمان وکفر کا فرق نہ جانے، توحید وشرک کا فرق نہ جانے، حق وباطل کا فرق نہ جانے، حلال وحرام کا فرق نہ جانے، اور فرض وواجب اور نفل کا فرق نہ جانے، جو کہ آخری درجہ کی چیز ہے، وہ فرائض سے واقف نہ ہو، اور نہ عبادات سے واقف ہو، اور نہ اس کو یہ معلوم ہو کہ نماز پڑھنا فرض ہے، اور نہ نماز پڑھنا ہی اس کو آتا ہو، تو یہاں پچاس بیماریاں ہیں جن کا تعلق ان شفا خانوں سے ہے، ان مدارس سے ہے۔

سب سے بڑی ڈرنے کی بات

سب سے بڑی ڈرنے کی بات یہ ہے کہ آدمی زندگی گزارے اور اپنے مالک، اپنے رازق ہی کو نہ پہچانے، اور نہ اس کا شکر ادا کرے، اور اس کا نام بھی نہ لے، اور اس کے سامنے سر نہ جھکائے، بلکہ کھلی ہوئی اس کی نافرمانی کرے اور اس بنیاد پر کرے کہ اس کو معلوم نہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز؟ اور یہ حلال ہے کہ حرام؟ اور یہ سب کتنا ہو رہا ہے کہ ذرا آپ دیکھیے جہاں پر مرکز نہیں ہیں، وہاں پر جہالت کی وجہ سے وہ کام ہو رہے ہیں جو اس دین کا علم نہ ہونے، دین کا بنیادی علم نہ ہونے کی وجہ سے ہو رہے ہیں، جو کفر تک پہنچا دیتے ہیں اور جہنم کا مستحق بنا دیتے ہیں۔

بھائی! بیماری کسی کو پسند نہیں، ہم کسی طریقہ سے بیماری کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، کوئی سخت لفظ نہیں بول سکتے، مگر یہ حقیقت ہے کہ کوئی اِس راستہ سے خدا کے یہاں

جاتا ہے (آخرت کی طرف) اور کوئی اُس راستہ سے جاتا ہے، پچاسوں راستے ہیں، ان میں سے ایک راستہ مرض کا بھی ہے، لیکن منزل سب کی ایک ہے، جو جس راستہ سے جائے گا اللہ کے یہاں پہنچے گا، لیکن جو اللہ کے یہاں پہنچے اور اللہ ہی کو نہ پہچانتا ہو، آپ دیکھ لیجیے کہ یہاں آپ آئے ہیں تو خود بخود آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کون لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، کہاں سے آئے ہیں، الہ آباد سے، کہاں سے تشریف لائے یا دوسری جگہ سے، لکھنؤ سے تشریف لائے، اور پھر جس شہر میں آپ جاتے ہیں، تو وہاں آپ جاننا چاہتے ہیں، یہاں کا حاکم کون ہے؟ اس کی کوٹھی کہاں ہے؟ اس کا مکان کہاں ہے؟ بازار کہاں ہے؟ دوا خانہ کہاں ہے؟ شفاخانہ کہاں ہے؟ تو یہ سب چیزیں تو بالکل جزئی ہیں، وقتی ہیں اور بہت ہی محدود ہیں، لیکن سب سے بڑی چیز جس سے بڑھ کر خطرناک کوئی چیز نہیں ہے زہر ہے، زہر کی کیا حقیقت ہے؟ انسان کو موت تو ہے ہی، اس کا مقدر ہے، لیکن دنیا میں رہے اور خدا کو نہ پہچانے اور خدا کو راضی کرنے کا طریقہ نہ جانے اور خدا کے پیغمبروں کے احسانات کو نہ مانے، نہ جانے نہ مانے اور نہ ان سے تعلق پیدا کرنے کی اس کے اندر خواہش ہو اور کھائیں پئیں اور اللہ کی نعمتوں کا استعمال کریں، اور خدا کے سامنے سر جھکانا ہی نہ جانیں، یا جانیں مگر اس کے بعد سر نہ جھکانے سے جو وبال آئے گا، جو نقصان ہوگا، وبال پڑے گا، اس کو پورے طور سے نہ جانیں، آج جو لوگ نماز چھوڑے ہوئے ہیں، وہ عادت ہے ایک طرف، لیکن ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ نماز چھوڑنے والے کی سزا کیا ہے؟ ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ صبح سے شام تک بولتے رہتے ہیں، سنتے رہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا نام بیچ میں لینے کی توفیق ہی نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نام لینے کا اجر و ثواب اور درجہ ہی نہیں جانتے۔

پھر آنحضرت (ﷺ) جو ہمارے محسن اعظم ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے بعد سب سے بڑا احسان آپ کا ہے، جنہوں نے ہمیں آدمی بنایا، سچی بات یہ ہے کہ ہمیں جانور سے آدمی بنایا، ان کا احسان ہم کو نہیں معلوم، نہ ان کے حالات معلوم، نہ معجزات معلوم کہ کس طریقہ سے آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا کر اور کیسی کیسی تکلیفیں اٹھا کر، اور کیسے کیسے خطرات مول لے کر اور کس طرح اپنی پاک جان کو اور خاندان کو سب کو خطرے میں ڈال کر اللہ کا پیغام پہنچایا، اس

کی بدولت آج ہم آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، مفت میں مسلمان ہیں کہ ہم نے کیا کیا اسلام حاصل کرنے کے لیے اور اسلام سیکھنے کے لیے، کتنی بڑی دولت ہمیں مفت مل گئی، یہ سلسلہ ہمارے بزرگوں کا چلا آرہا ہے (غَفَرَاللّٰهُ لَهُمْ) ان کی وجہ سے وہ کلمہ ہمیں میراث میں، ترکہ میں مل گیا کہ ہم ''لَاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' پڑھتے ہیں۔

اللہ کی مرضیات ونامرضیات کے جاننے کی ضرورت

لیکن بھائیو اتنا کافی نہیں، اب اس کے بعد جاننے کی ضرورت ہے، جیسے کہ آپ کہیں نوکری کریں تو آپ جاننا چاہتے ہیں جس کے آپ کے نوکر ہیں، جس سے آپ کا واسطہ ہے کہ افسر کیسا ہے؟ اس کا مزاج کیا ہے؟ کس چیز سے خوش ہوتا ہے اور کس چیز سے ناخوش ہوتا ہے؟ یہاں تک کہ آپ گھر والوں کے مزاج تک کو جاننا چاہتے ہیں، یہ سب ایک آدمی کو راضی کرنے کے لیے ہوتا ہے، جو نہ آپ کا مالک ہے اور نہ آپ کی قسمت کا مالک ہے، اور نہ آپ کی موت وزندگی کا مالک ہے، یہ سب آپ کرتے ہیں، اور وہ اللہ جس نے ہم کو پیدا کیا، عدم سے وجود میں لایا، نیست سے ہست کیا، اور یہ مٹی جس پر آپ بیٹھے ہیں، اسی طرح ہم بھی کچھ نہیں تھے، اللہ نے ہم کو وجود بخشا اور پھر اس سے بہتر وجود اور اس سے بہتر وجود اور ترقی دیتا رہا ''مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ'' [سورة غافر:٦٧]، یہ سب اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے، جو انسان کے مرحلے گزرتے ہیں کہ دنیا میں آنے سے پہلے شکم مادر میں اور کیا تھا، وہ سب بتادیا اور پھر اس کے بعد معلوم نہیں کس کس طرح حفاظت فرمائی، بیماریوں سے حفاظت فرمائی، دشمنوں سے حفاظت فرمائی، جانوروں سے حفاظت فرمائی، کیڑوں مکوڑوں سے حفاظت فرمائی، سانپ بچھو سے حفاظت فرمائی۔

اللہ کے انعامات واحسانات اور صفات کے جاننے کی ضرورت

یہ سب انعامات اس کے ہیں ''وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوْهَا'' [سورة إبراهيم:٣٤]، ''اگر تم اللہ کے احسانات شمار کرنے پر آؤ تو شمار نہیں کرسکتے،'' تو پھر کیا اس کا

حق نہیں کہ آپ اس کے احسانات کو جانیں، اس کی صفات کو جانیں اور مانیں بھی، اور اس کے نہ جاننے سے جو خطرہ ہے اس سے بھی واقف ہوں، اور اس کو ضروری سمجھیں، واجب سمجھیں اور حق سمجھیں، باقی کسی کی عبادت، بڑے سے بڑا حکمراں ہو، بادشاہ ہو، طاقتور ہو، فاتح ہو، دولت مند ہو، لیکن کسی کے سامنے سر جھکانا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ آپ کو یاد ہوں، وہ سیکھیں، درود شریف یاد ہو وہ پڑھیں، سیرت پڑھ کر آپ کے دل میں عشق نبوی بیدار ہو، ابھی آپ نے نعت سنی جو قاری طیب صاحبؒ کی کہی ہوئی ہے، اور ہمارے یہاں تو نعتوں کا کتب خانہ ہے، اور اردو میں کتب خانہ شاید نعت کے سلسلہ میں عربی سے بھی بڑھا ہوا ہو، یہاں جیسے جیسے نعت گو شاعر پیدا ہوئے، باہر کے لوگ بھی رشک کرتے ہیں، اس کا تعلق فلسفۂ زبان سے ہے، اور تاریخ ادب سے ہے، تو آپ کو یہ سب معلوم ہونا چاہیے۔

دینی تعلیم

اور پھر بڑی بات یہ ہے کہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْآ أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَاراً، وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ، عَلَيْهَا مَلآئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّايَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآأَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾[سورة التحريم:٦]

''اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو ایسی آگ سے جس کا ایندھن (یہ لکڑی نہیں ہے) آدمی ہیں، اور پتھر ہیں، اس پر مقرر ہیں فرشتے تندخو، زبردست، وہ نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جو بات فرمائے ان کو، اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہو۔''

تو کس طرح بچاؤ؟ وہ یہ کہ دین سکھاؤ، دین کی تعلیم دو، کفر وایمان کا فرق بتاؤ، توحید وشرک کا فرق بتاؤ، حلال وحرام کا فرق بتاؤ، جائز وواجب کا فرق بتاؤ، اس کے لیے یہ مدرسے قائم ہیں۔

اگر کسی ملک میں دین تسلسل کے ساتھ اور پائیدار طریقہ پر باقی رہ سکتا ہے تو وہ دینی تعلیم سے ہی باقی رہ سکتا ہے، ورنہ دیکھنے والوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے، پڑھنے والوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے کہ جن ملکوں میں، جن علاقوں میں دینی تعلیم کا سلسلہ بند ہو گیا، وہاں

بالکل اسلام ختم ہوگیا، یہ اسپین جو اسلام کا اتنا بڑا مرکز تھا کہ امام مالکؒ کے ماننے والے مالکیہ اہل قرطبہ کا عمل حجت مانتے ہیں، کوئی یہ کہہ دے قرطبہ والے ایسا کرتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ یہ دینی بات ہے۔ وہاں جب اسلام کے مخالفین کا غلبہ ہوا تو انھوں نے دینی تعلیم بند کردی، ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ لوگ چھپ چھپ کر اپنے بچوں کو دینی کتابیں پڑھاتے تھے، الف، ب کے حروف سکھاتے تھے، اور چھپ چھپ کر نکاح ہوتا تھا، اس کی اجازت نہیں تھی کہ کسی جگہ کھل کر یا کسی کمرہ میں علانیہ اسلامی طریقہ پر نکاح ہو، عیسائی طریقہ پر سامنے ہوجاتا تھا، پھر الگ جاکر اسلامی طریقہ پر ہوتا تھا، تاکہ وہ حلال ہو، تاکہ شرعی تعلق ہو، چنانچہ اسپین کا وہ حال ہوا کہ بقول علامہ اقبالؔ کے

ع آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

فضا ہے اذان نہیں، اور زمین ہے لیکن سجدہ نہیں، کان ترستے تھے اذان کو، ہم وہاں جاچکے ہیں، قدرتی سامان تھا کہ جہاں تک اسلامی شہنشاہیت رہی، اس کے آخری سرے تک ہمارا جانا ہوا، طلیطلہ (جہاں سے فرانس وغیرہ کا علاقہ شروع ہوتا ہے) سے لے کر غرناطہ تک جہاں سے مسلمان مراکش منتقل ہوئے ہیں، سمندر پار کر کے انھوں نے وہاں پناہ لی ہے، (اپنے اسلامی ملک میں) وہاں تک ہمارا جانا ہوا ہے، مسجدیں ہیں، قرطبہ کی مسجد، ہندوستان میں بھی ایسی مسجد ملنی مشکل ہے، خالی پڑی تھیں، سنا ہے کہ اب اجازت ہوئی ہے۔

میرے عزیز بھائیو! اب زیادہ بولنے کا وقت نہیں ہے کہ علم کی ضرورت کھانے پینے اور غذا سے کم نہیں ہے، اس لیے کہ غذا نہ ملنے سے کیا ہوگا، آدمی کمزور ہو پڑ جائے گا، چل نہیں پائے گا، زیادہ سے زیادہ جو برا نتیجہ ہو سکے گا نکلے گا، لیکن علم کے نہ ہونے پر اندیشہ ہے کہ کہیں وہ جنت سے محروم نہ ہوجائے، آگے کیا کہا جائے کہ کہیں اللہ کا غضب اس پر نازل نہ ہو، ابدالآباد کی زندگی لاکھوں کروڑوں کی گنتی سے اس کا شمار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اللہ کے عذاب میں مبتلا رہے، ڈرنے کی جو چیز ہے وہ جہالت ہے، اور اس کا علاج کیا ہے؟ مدرسوں کا قیام، مکتبوں کا قیام!

مکاتب و مدارس کی فکر کیجیے!

ہم اسی ضیاء العلوم کے بارے میں نہیں کہتے، جو ہمارے گھر کا مدرسہ ہے، ہمارے خاندان سے تعلق ہے، اس کے بانی ہمارے خاندان کے عزیز تھے، اور اب بھی وہ لوگ اس کے ذمہ دار ہیں، نہیں! ہم تو کہتے ہیں کہ آپ جہاں جہاں سے آئے ہیں، جس جس قصبہ اور دیہات سے آئے ہیں، وہاں آپ فکر کیجیے، اور سب سے ضروری کام یہ سمجھئے کہ وہاں مکتب اور مدرسہ ہو، اور کم سے کم مسجد ہی میں قائم ہو، ہمارے زمانہ میں پہلے رواج تھا کہ ہر کھاتے پیتے آدمی کے یہاں ملا مولوی صاحب آتے تھے، اور گاؤں سے سب لڑکے وہاں جمع ہوجاتے تھے، گھر میں کوئی خاتون کچھ پڑھاتی تھیں، خاندان کی سب لڑکیاں جمع ہوجاتی تھیں، اس سے بڑا فائدہ ہوا، اب صرف اس سے کام نہیں چلے گا، اب آپ کو ہر ہر جگہ مدرسہ ومکتب قائم کرنا ہوگا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں ایک ایسا مرکز بنادیا جہاں آپ نے یہ روداد سنی، اور یہاں جائس کے قریب نصیرآباد کی طرف آپ جائیں وہاں فلاح المسلمین کے نام سے مدرسہ ہے جو چھوٹا ندوہ معلوم ہوتا ہے، اور ایسے پچاس ساٹھ کے قریب ہمارے مدارس ہوں گے جو ندوہ کے تابع ہیں اور جہاں ہزاروں ہزار لاکھوں لاکھ کا خرچ ہے، اور کہیں ۴۰۰، ۵۰۰ اور کہیں ۸۰۰ تک لڑکے پڑھتے ہوں گے، اورنگ آباد جائیے، بھوپال جائیے، اور ادھر کرناٹک میں بھٹکل کی طرف جائیے، ندوہ کا نصاب جہاں پڑھایا جاتا ہے، اور وہ مدارس ندوہ سے ملحق ہیں اب درجنوں کی تعداد میں وہ پہنچ رہے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے یہاں مدرسہ قائم ہوا، لیکن یہ ذمہ داری صرف خاندان کے لوگوں کی اور ندوہ والوں کی نہیں ہے، بلکہ شہر والوں کی بھی ہے اور اطراف شہر میں رہنے والوں کی بھی ہے، وہ اس پر شکر بھی کریں، فخر بھی کریں اور اس کی فکر بھی کریں، اس کی خبر بھی لیں کہ بھائی! آپ کے یہاں کیا ضرورت ہے؟ کس چیز کی کمی ہے؟ اور یہ احسان اللہ کا مانیں کہ اللہ کے کچھ بندوں نے اللہ کے بھروسہ پر یہ مدرسہ قائم کردیا، کسی نے زمین دے دی، کسی نے کچھ دے

دیا، اور آج یہ عمارت کھڑی ہوئی ہے، لیکن یہ صرف طلبہ کے رہنے کے لیے کافی ہو جاتی ہے، ایک درسگاہ کی ضرورت ہے، اس کے لیے آج میرے گنہگار ہاتھوں سے بنیاد رکھ دی گئی۔

اب آپ حضرات کا یہ اخلاقی، دینی قدردانی کا تقاضا ہے کہ اب آپ اس کی تکمیل کی کوشش کریں اور اس کی دلچسپی رکھیں، اس کی فکر کریں، یہ نہیں کہ آج آپ کو بڑے زور وشور سے لوگوں کا حوالہ دے کر بلایا گیا، علماء آئیں گے، ندوہ کے لوگ آئیں گے، فلاں مقرر جن کو دور دور سے بلایا جاتا ہے وہ آئیں گے، تو آپ آگئے، اتنا نہیں بلکہ خود اپنے شوق سے کبھی آئیں، خود اپنی رضا اور رغبت سے آپ آئیں، اور دیکھیں اور پوچھیں اور اس کی خدمت کو دین کی ایک خدمت سمجھیں۔

بس میں اس پر ختم کرتا ہوں، ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا ہے، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نظر بد سے محفوظ رکھے اور اس میں برکت عطا فرمائے اور ہر طرح کے بیرونی واندرونی، شیطانی ونفسانی خطروں سے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے، اس کے اساتذہ کو زیادہ سے زیادہ رغبت اور شوق عطا فرمائے، اور اللہ تعالیٰ اس کو اور ترقی دے یہاں تک کہ یہاں اور بڑی بڑی کتابیں پڑھائی جانے لگیں، اور یہاں سے نکلنے والے مبلغ بنیں، اور مجاہد فی سبیل اللہ بنیں، اللہ کے راستہ میں کوشش کرنے والے، اللہ کے راستہ میں جانفشانی سے کام کرنے والے بنیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (آمین) [۱]

---

(۱) مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور (رائے بریلی) کے سالانہ جلسہ اور درسگاہ کی تقریب سنگ بنیاد کے موقع پر ۱۴۱۴ھ میں کی گئی حضرت مولاناؒ کی اہم صدارتی تقریر، یہ تقریر بعد میں رسالہ کی شکل میں شائع ہوئی۔

مدارس و مکاتب سائنس کا حکم رکھتے ہیں

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

حضرات علمائے کرام، برادرانِ عزیز!

پھلت کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہر صاحب علم کو خاص طور پر جو تاریخ کا طالب علم رہا ہو، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ کا، اس کے لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ اسے پھلت کے وہ نامور (افراد) یاد آجائیں جو صرف پھلت ہی کے لیے باعثِ فخر نہیں، بلکہ تمام عالم اسلام کے لیے باعث فخر ہیں۔

بارہویں صدی ہجری جس میں اس عہد کا سب سے بڑا عالم دین، یہ میں پوری بصیرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اسرار شریعت کا سب سے بڑا شارح، مسلمانوں کی زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کا قائد یعنی حضرت شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ)، مجھے تاریخ لکھنے کے سلسلے میں، خصوصاً شاہ ولی اللہؒ کے عہد کی شخصیتوں، تحریکوں پر قلم اٹھانے کے سلسلہ میں اس عہد کا مطالعہ کرنا پڑا، علامہ اقبالؒ نے مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں کہا تھا ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

میں اسی مطالعہ اور فکر کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے برصغیر میں اب تک حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شروع کیا ہوا دور چل رہا ہے، عربی مدارس، دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جتنے بھی مدارس اسلامیہ ہیں، یہ سب امتداد اور تسلسل ہے حضرت شاہ ولی اللہ کے مسلک و مزاج کا، ان کا مزاج ہے: ولی اللّٰہی، اور اس وقت تک ہی ان میں خیر و

برکت اور افادیت ہے جب تک ان میں ولی اللّٰہی مزاج قائم ہے، اس لحاظ سے ہمارے لیے پھلت سیر گاہ نہیں، بلکہ زیارت گاہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اخلاف اور خلفاء دونوں عطا کیے ہیں، اخلاف میں امام الہند شاہ عبدالعزیزؒ، علوم عقلیہ کے امام شاہ رفیع الدین دہلویؒ اور شاہ عبدالقادرؒ جن کا ترجمہ قرآن پاک مشہور ہے، غیر عربی میں اب تک کسی بھی زبان میں ان سے بہتر ترجمہ کسی نے نہیں کیا، پھر ان کے چوتھے صاحبزادے شاہ عبدالغنیؒ جن کو موقع نہیں ملا، اللہ نے ان کو نعم البدل یہ عطا فرمایا کہ شاہ اسماعیل شہیدؒ جیسا '' مِنْ أَذْكِيَاءِ الْعَالَمِ '' فرزند ملا، یہ تو ان کے اخلاف تھے، اور خلفاء میں آپ دیکھیں: سید احمد شہیدؒ خلیفہ شاہ عبدالعزیزؒ، مولانا عبدالحیؒ، شاہ محمد اسحاقؒ جو درس وتدریس کے بھی امام ہیں اور سلسلۂ تصوف وشریعت کے بھی ہیں، دہلی کو یہ خانوادہ پھلت کا عطیہ ہے۔

ہمیشہ قصبات نے ہی شہروں کو تازہ خون عطا کیا

پھلت میں داخل ہوتے ہی یہ تمام تاریخ سامنے آجاتی ہے، اور یہ تاریخ وہی ہے عالمِ اسلام کی کہ جب دارالحکومت میں عہدوں کو حاصل کرنے کی وجہ سے، مصنوعی زندگی کی بناء پر قویٰ سست ہونے لگے، رگوں میں خون منجمد ہونے لگا، تو قصبات نے نیا خون عطا کیا۔ آپ نے نہ صرف سلطنت مغلیہ کے دارالخلافہ بلکہ مرکز علم وسلوک وجذبۂ جہاد دہلی کو پھلت نے اتنا بڑا تحفہ عطا کیا، خانوادۂ ولی اللّٰہی، اس سے بڑھ کر تحفہ اور کیا ہوسکتا ہے۔!!

جس طرح لکھنؤ کو سہالی کے ایک قصبہ نے خانوادۂ علمائے فرنگی محل عطا کیا، ایسے ہی جب بغداد میں اضمحلال پیدا ہوا، حکومت کے شر نے قویٰ کو مضمحل کردیا، اور سوائے حصولِ منصب کے کوئی مقصد لوگوں کے سامنے نہیں رہا، تو ایران کے ایک قصبہ جیلان نے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا تحفہ دیا، جس نے پورے عالم اسلام کو عشق الٰہی کے سوز سے بھر دیا، جس کی لہریں افریقہ تک پہنچیں، ایسے ہی ایران کے ایک معمولی قصبہ نے امام غزالیؒ جیسا مفکر عطا کیا، الغرض قصبات نے ہر دور میں دارالحکومت کو ایسا چمکتا ہوا، دمکتا ہوا نیا خون عطا کیا جس

نے پورے پورے ملکوں کو گرما دیا، بہت سے لوگ اس کو بھول جاتے ہیں کہ یہ نیا خون کس نے عطا کیا، بڑے بڑے شہروں کی تاریخ سامنے آجاتی ہے اور وہ آڑ بن جاتی ہے، جہاں ایسے مردم خیز قصبوں میں جا کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہاں کیسے کیسے باکمال پیدا ہوئے، خدا کی دین کی بھی کوئی حد نہیں، اس کی قدرت کی وسعت معلوم ہوتی ہے، وہاں یہ ذہن بھی جاتا ہے- جونفسیاتی ردعمل بھی ہے- کہ اب ایسے لوگ پیدا نہیں ہو سکتے اور خدا کی مردے سے زندہ کو پیدا کرنے کی جو قوت ہے (يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ) اس کو بھول کر ذہن کے کسی گوشہ میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ اب تو بس تاریخ کو اور ان کے کارناموں کو پڑھنا چاہیے، اور اپنے معاش میں لگنا چاہیے۔

اللہ کی بخشش لامحدود ہے

تو آپ کے سامنے پھلت کا جو تاریخی تعارف کرایا گیا ہے، اس نے مجھے آمادہ کیا کہ میں یہ آیت پڑھ کر سناؤں: ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰـؤُلَآءِ وَ هٰـؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوراً﴾ [سورة الإسراء: ٢٠]، ہم ان کو بھی بھر بھر کر دیتے ہیں اور ان کو بھی: ﴿هٰـؤُلَآءِ وَ هٰـؤُلَآءِ﴾ اور دیتے رہیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ مضارع کا صیغہ حال اور مستقبل دونوں کے معنی دیتا ہے، یعنی یوں کہنا کہ "ہم دیتے ہیں" صحیح نہیں، اور "دیتے رہیں گے" یہ بھی صحیح نہیں، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "دیتے ہیں اور دیتے رہیں گے"، تمہارے رب کی دین میں کوئی راشننگ ہی نہیں ہے کہ اب اگر دے دیا تو انتظار کروائے گا برس کا، ہمارے رب کی عطا میں کوئی راشن نہیں ہے، کیونکہ اس کی بخشش لامحدود ہے: ﴿وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوراً﴾۔

اکبر الہ آبادی مرحوم نے کہا تھا۔

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی، آثار ونشاں بھی قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

لیکن اس کی کچھ شرائط ہیں، ہمت بلند ہو، اخلاص وسعی ہو، اللہ تعالیٰ نے کوشش کی بھی

جا بجا تاکید کی ہے، اللہ تعالیٰ کسی کوشش کرنے والے کی کوشش کو ضائع نہیں کرتا، تو یہ ملت تو محبوب ہے، "رحمۃٌ للعالمین" کی ملت ہے، اشرف الامم ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو انسانیت بھی عزیز ہے، اپنی پیدا کی ہوئی دنیا بھی عزیز ہے، جس ماحول کا ہمارے لیے انتخاب کیا گیا ہے یا ہمارا جس ماحول کے لیے انتخاب کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہمارا جوڑ ہو اور ہم اس فضا میں اپنی افادیت ثابت کریں، ہمارے اکابر مجدد الف ثانیؒ ہوں یا شاہ ولی اللہؒ ہوں، یا شاہ عبدالقادرؒ ہوں، انھوں نے زمانے کی نبض پہچانی، انھوں نے دیکھا کہ زمانے کو روحانیت کی ضرورت ہے، علم صحیح کی ضرورت ہے، توحید خالص کی، عہدوں اور انانیت سے بلند ہو کر اعمال میں روح پیدا کرنے کی ضرورت ہے، طلبِ رضائے الٰہی کی ضرورت ہے، ایسے ہی انھوں نے دیکھا کہ اس وقت انسانیت کس چیز کی پیاسی ہے؟ وہ زندہ رہنے کا استحقاق کھوتی چلی جارہی ہے، اس سے جو مظالم سرزد ہورہے ہیں، اس سے جو حق تلفیاں ہورہی ہیں، اس سے جو خونِ انساں ارزاں ہورہا ہے اور پانی کی طرح بہہ رہا ہے، کہیں اللہ تعالیٰ نسلِ انسانی کے خاتمہ کا فیصلہ نہ کرلے کیونکہ ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً، وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ﴾ [سورة الرعد:۱۷] "جو جھاگ ہے وہ چلا جاتا ہے، اور جو چیز نافع ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔" معلوم ہوا کہ بقا مربوط ہے نافعیت کے ساتھ، جو چیز اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے، جو گروہ، کوئی مرکز، دعوت، یا تحریک اپنی نافعیت کھو بیٹھتی ہے وہ اس کی مستحق نہیں رہتی کہ قائم رہے، یہی سنت اللہ ہے۔

اسلاف کے احسانات

ان بزرگانِ دین نے دونوں کام کیے، ہماری نظر اس پر تو جاتی ہے کہ انھوں نے ملت کو کیا دیا، حدیث و تفسیر میں کیا نئی راہیں نکالیں، علوم اسلامیہ میں کتنا عمق پیدا کیا، ماحول میں کیا روحانیت پیدا کی، لیکن ہماری نظر اس پر نہیں جاتی کہ انھوں نے غیر مسلموں کی نظر میں اسلام کا کس درجہ احترام پیدا کیا، سیرت نبویؐ کو غور سے دیکھنے، پڑھنے، مطالعہ کرنے پر کس طرح آمادہ کیا؟ مؤرخین نے بھی اس پر پردہ ڈالا، جہاں انھوں نے علم کے دریا بہائے،

مسندِ درس بچھائی، وہیں اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے دل میں حضور (ﷺ) کے رحمۃ للعالمین ہونے کا، اسلام کے حقانی و مطابق عقل ہونے کا اور اسلام کے اس دنیا کی پیاس بجھانے کا ثبوت دیا، یقین دلایا، ہمارے سوانحی لٹریچر میں یہ پہلو بہت مغلوب رہ گیا ہے۔

آج میں کہتا ہوں کہ ملت اسلامیہ کو یہ دونوں کام کرنے ہیں، عقائد صحیحہ، عباداتِ مقبولہ، طلبِ خداوندی کے ذریعے ملت کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے صحیح بھی ہو، قوی بھی ہو، دونوں چیزیں ضروری ہیں، صرف صحیح ہونا کافی نہیں، قوی بھی ہو، صرف قوی ہونا کافی نہیں، صحیح بھی ہو، عبادت تو مشرکین بھی کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّ تَصْدِيَةً﴾ [سورۃ الأنفال: ۳۵]، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خصوصاً اس زمانے میں ملت کا یہ فریضہ بھی ہو گیا ہے کہ اپنی نافعیت ثابت کرے، ہماری وجہ سے کتنی بلائیں ہیں جو ٹل رہی ہیں، ہم اس ملک کے لیے باعث رحمت و برکت ہیں، یہ جب ہی ہوگا جب آپ صحیح انسان بن کر بازاروں، دفتروں میں جائیں، جو انھیں سوچنے پر مجبور کرے کہ وہ کون سا مذہب ہے جس نے ہمیں ایسا انسان بنا دیا، ہم بتائیں کہ اس ملک کے لیے پہاڑ، دریا، سمندر اتنے ضروری نہیں جتنے کہ ہم، ہمارا پیام انسانیت، ہماری خدا ترسی۔

امت مسلمہ ایک خطرناک دوراہے پر

ہم ایسے دوراہے پر آ گئے ہیں کہ ایک راستہ سیدھا ارتداد کی طرف جا رہا ہے، میں اس سے کم درجہ کا لفظ استعمال کرنے پر تیار نہیں، اگر کوئی آسمان سے ویسا اشارہ نہ ہوا، قدرت خداوندی کی کوئی مداخلت نہ ہوئی تو اس کے صاف آثار ہیں، آثار ہی نہیں بلکہ آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے، تصور کی آنکھ سے جس میں صرف تصور ہی نہیں بلکہ تصویر بھی شامل ہے کہ آئندہ نسل شاید اسلام کے بنیادی عقائد سے بالکل ناآشنا ہو، صرف آشنا منفی طور پر ہی نہیں بلکہ اس کے بالمقابل اسلام کے برخلاف عقائد و تصورات کی حامل ہو، مشرکانہ عقائد کی قائل ہو، ایسے خطرناک دوراہے پر آ گئے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو اس کی توفیق نہ ہوئی کہ اس کے لیے اپنی ساری توانائی صرف کر ڈالیں، تو شاید آنے والی نسل ۲۵ برس بعد یہ تو زیادہ کہہ دیا بلکہ

۱۵ ؍برس کے بعد خطرہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول کے نام سے بالکل نا آشنا ہو، اس کی مثالیں سامنے آنے لگی ہیں کہ اسکولوں کے بہت سے بچے اللہ کا لفظ صحیح نہیں لکھ سکتے، پوچھتے ہیں کہ ہم اللہ کس طرح لکھیں؟ اور آج نوجوانوں کی ایک تعداد یہ سمجھتی ہے کہ اس دھرتی کو کرشن یا رام چلاتے ہیں، ہندو علم الاصنام، ہندو دیو مالا بچوں کے ذہنوں پر اثر کر رہی ہے، ابھی ٹی وی پر ''رامائن'' جو سیریل چل رہا ہے، کالج کی جو کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں، اس سے جوانوں کے ذہن و دماغ متاثر ہو رہے ہیں۔

نسل نو کو جہنم سے بچائیے

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْآ أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَاراً﴾[سورة التحريم:٦]

معاملہ عالم و فاضل یا مفسر و محدث بنانے کا نہیں، بلکہ معاملہ ہے جہنم سے بچانے کا، دوزخ کی آگ سے بچانے کا، ایک جلسہ میں ایک بہن ایسی تھیں کہ جن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، عورتوں نے پوچھا کہ بہن! سر میں درد ہے؟ کچھ پیٹ میں تکلیف ہے؟ بولیں کہ کچھ نہیں، پھر مزید اصرار پر بتایا کہ میں بچہ سوتا ہوا چھوڑ کر آئی تھی، اس سے کچھ فاصلہ پر دیا سلائی رکھی ہوئی ہے، اگر وہ بچہ جاگ گیا اور چل کر وہاں تک گیا اور دیا سلائی سے تیلی نکال لی، پھر اپنے کپڑوں میں آگ لگالی تو کیا ہوگا؟ عورتوں نے پوچھا کہ بچے کی عمر کیا ہے؟ بولی: ''ڈھائی سال کا ہے''، سب نے کہا: ہوش کی باتیں کرو، وہ چھوٹا بچہ چارپائی سے کیسے اترے گا؟ اور پھر چل کر وہاں تک جائے گا؟ اور جا کر وہ یہی ایک کام کرے گا؟ جواب دیا کہ تمہارا بچہ ہوتا تو جانتیں؟ میرا بچہ ہے اس لیے مجھے ڈر ہے۔

والدین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیوں نہیں؟

میں پوچھتا ہوں کہ آج ہمارے ماں باپ کے دل میں یہ خیال پیدا کیوں نہیں ہوتا کہ اگر ہم نے بچہ کو کلمہ، نماز نہ سکھائی، توحید کا سبق یاد نہ کرایا، ابراہیم (علیہ السلام) کی بت شکنی نہ سمجھائی تو کل وہ مشرک اٹھے گا، یہاں تو بالکل خطرات نہیں بلکہ مشاہدات ہیں، وہاں تو ایسا

دور دراز کا اندیشہ تھا، میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک لڑکا ڈھال کی سڑک پر سائیکل پر جارہا ہے اور آگے گہری کھائی ہے، سائیکل کے بریک بھی نہیں ہیں، تو باپ بے چین ہو اٹھے گا، کہے گا کہ بیٹا! آگے کھائی ہے، سائیکل سے اتر جاؤ، اسی طرح آج ہمارے سامنے ایک گہری کھائی ہے، وہ کھائی ہندو دیو مالا کی ہے، بت پرستی ہے، مسلمانوں کے دلوں سے شرک و بت پرستی کی طرف سے ایسے گھن آنا ضروری ہے جیسے پاخانہ پیشاب سے بلکہ اس سے زیادہ گھن آنا ضروری ہے۔ یہ تکدر، یہ تعفن، یہ وحشت دور ہوتی جارہی ہے، حالانکہ ایک مسلمان کو سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا ہونا تھا کہ کل وہ مشرکانہ عقائد لے کر نہ اٹھے، حضرت خضر (علیہ السلام) کا ایک بچہ کو قتل کر دینے کا واقعہ تشریعی نہیں ہے، اس پر عمل آج نہیں ہوسکتا، مگر یہ قصہ قرآن میں قیامت تک پڑھا جائے گا، اس کا مقصد وافادیت یہ ہے کہ مسلمان سمجھے کہ خاندان کے لیے فتنہ بننے والا بچہ کتنا منحوس ہوتا ہے، اس قصہ کو قرآن نے جگہ دی تا کہ معلوم ہو کہ یہ خطرہ کتنا بڑا تھا۔

مدارس و مکاتب سانس کا حکم رکھتے ہیں

پہلی بات تو یہ ہے کہ آئندہ نسلوں کو کھلی ہوئی بت پرستی سے، مشرکانہ عقائد سے بچانے کے لیے اپنے گھٹنے ٹیک دیجیے، ہر ممکن کوشش کر ڈالیے، اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے لیے خالی وقتوں میں پرائیویٹ کلاسز کا انتظام کرائیے، یا ان مدارس و مکاتب میں داخل کرائیے۔

یہ مدارس و مکاتب آج ہماری ریڑھ کی ہڈی ہیں، سانس کا حکم رکھتے ہیں، اگر سانس چل رہی ہے تو ہم زندہ ہیں ورنہ ختم، اور اپنے ماحول کو مانوس کریں، فضا اگر یونہی اشتعال انگیز رہی تو کسی وقت چنگاری سے آگ لگ سکتی ہے، اگر ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر ناگواری کے آثار نمودار ہوتے رہے، وہ دیکھتے رہے کہ نہ ہم میں اخلاقی کردار نہ افادیت، ہم بھی وعدہ خلاف اسی طرح یہ بھی، جس طرح ہم جھوٹ بولتے ہیں اسی طرح یہ بھی، تو ہم صرف اپنے لیے ہی نہیں، بلکہ اسلام کے باقی رکھنے کے لیے بھی اس ملک میں خطرہ پیدا

کررہے ہیں، ہمارے اکابر جو افریقہ، مراکش، اسپین تک اسلام کو پھیلاتے چلے گئے، یہ صرف زبانی کام نہیں، بلکہ اس میں کردار بھی شامل تھا، جنھیں دیکھ کر خود بخود غیر مسلموں میں جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اسلام کو قبول کریں، مسلم پرسنل لا کی لڑائی اسی لیے لڑی گئی تھی کہ عائلی تعلقات میراث، طلاق، نکاح، سب اسلامی طریقہ پر ہوں، جس کے لیے سب مطالعہ کرنے والے علماء اپنے کمروں سے نکل کر میدان میں آئے، اپنے عائلی قانون کی بھی حفاظت کرنی ہے، اپنے ملی تشخص کی بھی حفاظت کرنی ہے، اس کا قریب ترین ذریعہ یہ دینی مدارس ومکاتب ہیں۔

تحریک پیام انسانیت

دوسرا کام یہ کرنا ہے کہ یہ تلخی جو پانی، ہوا، سانسوں اور ماحول اور فضا میں آگئی ہے، اسے دور کریں، اسلام کا تعارف کرائیں، ورنہ کسی چیز کا موقع باقی نہ رہے گا۔

"پیام انسانیت کی تحریک" یہ ایک چہار دیواری ہے، یہ ایک حصار ہے، اس میں بیٹھ کر آپ قرآن شریف پڑھیے، مسجد بنائیے، نماز پڑھیے، خدانخواستہ یہ ٹوٹ گئی تو؟ خدا ہمیں اس دن کے لیے زندہ نہ رکھے جب یہ مسئلہ چہار دیواری کے اندر آجائے اور مدارس ومساجد سب خطرے میں پڑ جائیں۔ میں جسمانی طور سے اس حالت میں نہیں تھا کہ اتنا بھی کہہ سکوں، آپ حضرات کے خلوص اور تعاون اور سکون نے اتنا کہلوادیا۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔ (۱)

---

(۱) مدرسہ فیض الاسلام، پھلت (مظفر نگر) کے ایک افتتاحی جلسہ میں کی گئی تقریر، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ، (شمارہ ۱۰ر اگست ۱۹۸۸ء)، یہ تقریر علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

امت کے تحفظ کا راستہ

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [سورة الحجر:۹]

قرآن مجید ذکر ہے

میرے عزیز بھائیو اور دوستو! میرے بزرگو! میں نے آپ کے سامنے قرآن مجید کی بہت مختصر سی آیت جو چند لفظوں پر مشتمل ہے، پڑھی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "بے شک ہم نے "الذکر" کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کی یقینی طور پر حفاظت کرنے والے ہیں۔"

یہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے لیکن ایک بہت بڑا مژدہ، ایک بہت بڑی بشارت، ایک بہت بڑی ضمانت ہے، ایک عظیم الشان اعلان ہے، جس پر ساری دنیا کے کان کھل جانے چاہئیں اور سب کو اس کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے، اس اعلان میں ایک عمومیت ہے، ایک زور ہے، ایک تاکید ہے، اور ایک یقین ہے، خاص کر مسلمانوں کے لیے تو یہ آیت بہت توجہ طلب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "بے شک ہم نے 'الذکر' کو نازل کیا،" اور جہاں تک میری معلومات ہیں اور تھوڑا بہت مطالعہ ہے، تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ "الذکر" سے مراد قرآن مجید ہے، "بے شک ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا۔"

قرآن مجید اور حاملین قرآن کی حفاظت کا وعدہ

اللہ تعالیٰ جس شاہانہ، شہنشاہانہ انداز میں، جیسے شاہی فرمان ہوتے ہیں، جمع کے صیغے کے ساتھ فرماتا ہے: "ہم نے اتارا ہے، ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" جو حضرات

عربی داں ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے کہ ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، ہم اس کی حفاظت کریں گے، کتنے طریقے ہو سکتے ہیں، اس کے ادا کرنے کے لیے قرآن مجید میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل الگ ہے، اس میں کئی طریقوں سے اس بات کو کہا گیا ہے، بڑی تاکید اور بڑی شدّ ومد کے ساتھ کہا گیا ہے کہ ہم ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، میں ان چیزوں کو جو عربی مدارس میں طلبہ کے سامنے بیان کرنے کی ہیں، اس عام مجمع میں نہیں بیان کر سکتا، لیکن عربی زبان کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تاکید کی کئی چیزیں جمع کر دی ہیں، ''إِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ '' اسم فائل کا صیغہ، پھر ''إِنَّا'' کے ساتھ، پھر ''لَهٗ'' کو مقدم کرنا، ''إِنَّا لَحَافِظُوْنَ لَهٗ'' کے بجائے ''إِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ''، یہ سب طریقے علم بلاغت سے تعلق رکھتے ہیں، علم نحو سے تعلق رکھتے ہیں، یہ آیت جس کے الفاظ گنے چنے ہیں، صرف چند، نہ معلوم ہم نے کتنی مرتبہ اور قرآن مجید میں تو ہزاروں مرتبہ پڑھی ہوگی، اور علماء کی زبان سے سنی ہوگی، مقررین کی زبان سے بھی نہ جانے کتنی مرتبہ سنی ہوگی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پورے مطالب پر، اس کے جو آفاق ہیں، جہاں تک یہ آیت پہنچتی ہے، جن حدود کو اس آیت نے سمیٹ لیا ہے، جو وسعت اس آیت کے اندر پائی جاتی ہے، اس پر میری پوری نظر ہے۔

توریت وانجیل کی حفاظت کا وعدہ نہیں

لیکن یہ آیت بڑی قابل غور ہے، ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے، اور توریت وانجیل کے متعلق آپ کو معلوم ہے قرآن مجید کے الفاظ کیا ہیں:

﴿بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ﴾[سورة المائدة:٤٤]

یعنی ''اللہ کی کتاب (توریت وانجیل) کی حفاظت کی ذمہ داری تو ان کے سپرد تھی، ان سے طلب کی تھی حفاظت کہ وہ اس کے محافظ بنیں گے، ان سے مطالبہ تھا کہ اپنی کتابوں کی حفاظت وہ خود کریں گے، اور وہ اس پر گواہ تھے۔''

توریت وانجیل کی ذمہ داری اللہ نے نہیں لی تھی، اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے انہی

قوموں کے سپرد کی تھی، جن کے لیے یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں، پھر اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ آپ تاریخ میں دیکھیے، اور مصنّفین نے (خاص طور پر اب جو جدید معلومات وتحقیقات روشنی میں آئی ہیں) انھوں نے بالکل اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ یہ کتابیں محفوظ نہیں رہیں، خود ان قوموں کے اصرار کے مطابق، ان قوموں کی شہادتوں کے مطابق، بلکہ ان کے اعلانات کے مطابق، اس موضوع پر اتنی کتابیں مسلمانوں کے قلم سے نہیں بلکہ خود یہودی اور عیسائی علماء کے قلم سے نکل چکی ہیں، جس میں انھوں نے ایسا صاف صاف اعتراف کیا ہے، جس سے بڑھ کر کوئی اعتراف ممکن نہیں، اور یہ سب نتیجہ اس کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام انہی کے سپرد کیا تھا: ﴿بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ لیکن اس آیت میں اس کے بالکل برخلاف کہا گیا ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ''ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

مستشرقین کا اعتراف

مجھے قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے، اس لیے کہ ہمارا آپ کا سب کا اس پر ایمان ہے اور ایک بڑے دشمن اسلام نے اس پر، جو آپ کے اس صوبہ متحدہ کا گورنر رہ چکا ہے، یعنی ''سر ولیم موز'' جس کی کتاب ''لائف آف محمد'' بڑی زہریلی کتاب ہے، یہاں تک کہ اس کتاب میں اس نے یہ لکھ دیا ہے کہ قرآن مجید کو کلام الٰہی مانے یا نہ مانے لیکن یہ تو ماننا پڑے گا اور اس کا اقرار کرنا پڑے گا کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) - یہ تو میں کہہ رہا ہوں، اپنے اور آپ کے عقیدے کے مطابق - نے جس کتاب کی تبلیغ کی، جو کتاب پڑھ کر سنائی، اس کتاب میں اس وقت تک ایک نقطے کا فرق نہیں ہوا، یہ آپ دیکھ لیجیے اور میں نے بھی اپنی بعض ناچیز تالیفات میں نقل کیا ہے صفحہ اور کتاب کے حوالہ کے ساتھ، عقیدے کی بات الگ ہے، اس میں وہ معذور ہے، یہ اللہ کا کلام ہے، لیکن یہ کہتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کر سکتا، اس میں کسی قسم کے شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ جو کتاب صحابۂ کرامؓ کی سنائی گئی تھی، اس نسل کو سنائی گئی تھی، اس عہد میں سنائی گئی تھی، وہ کتاب اس وقت تک ہے، اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی، تو قرآن مجید کی محفوظیت کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے، میرا ذہن اس طرف گیا ہے کہ آپ سے کہوں کہ اس قرآن مجید کی حفاظت کے وعدے میں اور کتنے

وعدے مضمر ہیں، اس پر غور فرمایئے، اور ہمارے لیے کتنی بڑی بشارت ہے، ہمارے مدارس کا اصل تعارف یہی ہے، اس کی اصل قدر و قیمت یہی ہے، اور یہ جو سلسلہ ہے، یہ جو کوششیں ہیں، جو آپ ساری دنیا میں دیکھ رہے ہیں، سن رہے ہیں، اور آپ کا ہندوستان تو الحمدللہ اس کا اب بھی بہت بڑا مرکز ہے، آپ کے اس کانپور میں کئی مدرسے ہیں، اور اس وقت بھی ایک مدرسہ کے سلسلے ہی میں آپ جمع ہوئے ہیں۔

مدارس کا اصل مقام

ان مداس کی اصل، ان کا مقام کیا ہے اور ان مدارس کی اصل قدر و قیمت کیا ہے؟ یہ بات صرف اس پر منحصر ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کے اعلان میں اور کتنی حفاظتوں کا اعلان فرمایا ہے، اور اس دنیا میں حقیقی تحفظ کا راستہ کیا ہے؟

یہ اس آیت سے معلوم ہوگا کہ ہم نے ہی ''الذکر'' کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے، جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''ہم اس کتاب کی حفاظت کرنے والے ہیں'' تو کیا آپ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب کسی کتب خانہ میں محفوظ رہے گی؟ یہ تو کوئی بچہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس زور شور کے ساتھ، اس آن بان کے ساتھ، اگر یہ صحیح ہیں بلکہ میں اس سے آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اس دھوم دھام کے ساتھ، اس شان و شوکت کے ساتھ، ساری دنیا کو تھرا دینے والی آواز کے ساتھ، جلال سلطانی نہیں، جلال شہنشاہی بھی نہیں، جلال خسروی بھی نہیں، بلکہ جلال الٰہی کے ساتھ فرمایا ہے کہ ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے، ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، ہم نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، ہم نے اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو اعلان اس شان کے ساتھ ہو، اس اعلان کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ کتاب کسی کتب خانہ کی زینت رہے گی؟ وہاں محفوظ رہے گی، کوئی اس کو پڑھنا چاہے گا تو پڑھ سکے گا، جیسے خدا بخش کے کتب خانہ پٹنہ میں، جیسے کتب خانہ آصفیہ میں، دارالعلوم دیوبند میں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں کتابیں محفوظ ہیں؟ ہمارے بزرگوں کی کتابیں ابھی تک محفوظ چلی آرہی ہیں، انھیں کیڑوں نے نہیں کھایا ہے، ان کو چوہوں نے نہیں کترا

ہے، اور دیمک ان کونہیں لگی ہے، کیا جو اللہ اپنی کتاب کے متعلق، جو پوری دنیا کو پیدا کرنے والا ہے، پھر اپنی عزیز ترین، جلیل ترین، عظیم ترین کتاب کے متعلق یہ اعلان کرے اور ساری دنیا کو سنائے، کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ضائع نہیں ہوگی؟ یعنی خدانخواستہ کسی سیلاب کی نذر نہیں ہوگی، کسی آگ لگنے کے حادثہ کی نذر نہیں ہوگی، جیسے کہ 'توریت' ٹائٹس رومی کے حملے سے، پھر بخت نصر کے حملے سے دومرتبہ ضائع ہوچکی ہے، یہودی علماء کے اعتراف کے مطابق، کسی چنگیز خاں کے حملے سے، کسی ہلاکو خاں کے حملے سے، کسی دشمن اسلام کے حملے سے ضائع نہیں ہوگی، کیا اس کا مطلب یہ ہے؟ نہیں! دیکھیے، ہر ہستی اپنے اعلان کا مطلب سمجھتی ہے، اپنے الفاظ کا مطلب سمجھتی ہے، معمولی انسان بھی جب کوئی اعلان کرتا ہے تو اس کے مضمرات کو خود سمجھ لیتا ہے، اس کے جو لوازم ہیں ان کو خود سمجھ لیتا ہے۔

حفاظت کے وعدے

یہ خواص کا مجمع ہے، ان خواص میں سے اگر کوئی کہے کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیے گا، آپ ہمارے گھر کیوں تشریف نہیں لاتے؟ آپ ہمارے گھر قدم رنجہ فرمائیے، ہمیں اپنی مہمانی کا شرف عطا کیجیے، تو ہر سمجھ دار آدمی سمجھ لیتا ہے کہ جب ان صاحب کے گھر جاؤں گا تو میری ضیافت بھی ہوگی، میری حفاظت بھی ہوگی، میری عزت بھی ہوگی، مجھے سونے کے لیے بستر بھی دیا جائے گا، مجھے کمرہ بھی ملے گا، مجھے پینے کے لیے ٹھنڈا پانی بھی ملے گا، اس کے کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی، کوئی اگر کہے تو یہ اس کی بدمذاقی کی بات ہوگی، اور یہ اس کی حیثیت کے لحاظ سے بھی اور اس مہمان کے لحاظ سے بھی ایک توہین کی بات ہوگی، یہ باتیں تو خود اس کے اندر مضمر ہی ہوتی ہیں۔ جب کسی شریف آدمی نے کہا کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیے، تو یہ اس کی حفاظت کا بھی اعلان ہے، اس کے اعزاز کا بھی اعلان ہے۔ اس میں بھی صرف یہ اعلان نہیں کہ یہ قرآن مجید سینوں میں محفوظ رہے گا، لوگ اس کو جیسا کہ نازل ہوا تھا، من وعن یاد کرلیں گے، اور تراویح میں سنا دیا کریں گے، نہیں، ﴿إِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ کے اندر پچاس اعلانات ہیں، سو اعلانات ہیں، اس کے اندر اعلان ہے کہ ہم اس کتاب کو، اس کتاب کے اندر جو مطالب ہیں، ان مطالب کو بھی ہم زندہ رکھیں گے، ہم

اس پر عمل کرنے کے سلسلے کو بھی باقی رکھیں گے، ہم اس کتاب کی حفاظت کرنے والوں کی بھی حفاظت کریں گے، اس کتاب کو یاد کرنے والوں کی بھی عزت کرائیں گے، اس کتاب کا علم حاصل کرنے والوں کے سلسلے کو بھی ہم باقی رکھیں گے، ہم اس زبان کو بھی محفوظ رکھیں گے جس زبان میں یہ نازل ہوئی ہے، اس زبان کے ان علوم کو بھی باقی رکھیں گے جو اس زبان کے سیکھنے کے لیے ضروری ہیں، ان مقامات کی بھی حفاظت کریں گے، اس ملک کی بھی حفاظت کریں گے جہاں کی اور جس ملک کی یہ زبان ہے۔

عربوں کی حفاظت کا وعدہ

میں نے عربوں سے کہا کہ امریکہ تمہاری حفاظت نہیں کرسکتا، روس ہزار اعلان کرے، امریکہ ہزار اعلان کرے، تمہاری حفاظت نہیں کرسکتے، تمہاری حفاظت تو ہوگئی جب اللہ نے فرمایا: ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ﴾، ہم اس قرآن کی حفاظت کرنے والے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، ان کو بھی قیامت تک باقی رکھیں گے، چنانچہ یہی زبان ہے جو آج اپنی اسی قرآنی شکل میں آج چودہ سو برس بعد بھی باقی ہے، ابھی چودہ سو برس ہونے والے ہیں، چودہ سو برس میں کسی زبان کی مثال نہیں دی جاسکتی۔

عربی زبان کا اعجاز

میں ایک لسانیات کے شائق، لسانیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، بلکہ چیلنج کررہا ہوں کہ روئے زمین پر، کرۂ ارض پر کوئی زبان ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جو چودہ سو برس نہیں، بلکہ ایک ہزار برس کے اندر اس میں انقلاب نہ آیا ہو، اور وہ زبان ایسی نہ ہوگئی ہو کہ ایک ہزار برس بعد اب اس کا کوئی سمجھنے والا نہیں، آج جو زندہ زبانیں ہیں فرنچ اور انگریزی، ان کا حال یہ ہے کہ دو سو برس پہلے کی وکٹوریہ کے عہد کی زبان آج پورے طور پر سمجھی نہیں جاتی، وہ زبان جسے وکٹورین لینگویج، وکٹورین انگلش کہتے ہیں، اس زبان کا چیلنج جاتا رہا، شیکسپیر (Shakespeare) اور ملٹن (Milton) جس زبان میں لکھا کرتے تھے، آج اس زبان کا طرز باقی نہیں، اس زبان میں اگر کوئی لکھے تو لوگ اسے گھور کر دیکھیں گے،

اور سمجھیں کہ اس زمانہ میں اس کی زبان نہیں چل سکتی، اس زبان کا چلن اب نہیں ہے۔

زبانوں کی تاریخ پڑھیں، لسانیات پر جو لٹریچر تیار ہوا ہے اس کو پڑھیں، تو معلوم ہوگا کہ سوسو برس میں زبانیں بدل جاتی ہیں۔ آپ کی اس اردو زبان کا یہی حال ہے، جس پر ہم کو بڑا فخر ہے، شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمۂ قرآن مجید جسے میں قرآن مجید ہی کے معجزات میں سے سمجھتا ہوں کہ غیر عربی زبان میں قرآن مجید کا اتنا کامیاب ترجمہ نہیں ہوا جتنا کامیاب ترجمہ اردو زبان میں شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ نے کیا ہے، لیکن ابھی ڈیڑھ سو برس مشکل سے ہوئے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ کو اسی زبان کے کئی ایسے الفاظ جو اَب سمجھے نہیں جاتے بدلنا پڑا، حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ اٹھا کر دیکھ لیجیے، ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ اٹھا کر دیکھ لیجیے، حضرت تھانویؒ کا ترجمہ اٹھا کر دیکھ لیجیے، کتنے لفظ ہیں جو دلی میں بولے جاتے تھے اور شاہ عبدالقادرؒ نے ان کو اپنے ترجمہ میں اختیار کیا، وہ آج متروکات میں سے ہیں۔

سوسو برس میں زبان پر اثر پڑ جاتا ہے، لیکن واحد زبان جو اس وقت لکھی جاتی ہے، سمجھی جاتی ہے، بولی جاتی ہے، اور دنیا کے ایک کنارے سے لے کر آپ چلیے، میں عالم اسلام نہیں کہتا، عالم عرب نہیں کہتا، اور دوسرے کنارے تک پہنچ جائیے، جہاں قرآنی زبان آپ بولیں گے، اگر کوئی کلمہ گو عربی سے واقف ہے تو وہ اس زبان کو ضرور سمجھ لے گا، مصر کی دارجہ بڑے بڑے علماء نہیں سمجھ سکتے، عراق کی روزمرہ کی بولی اور اس کا جو طرز ہے وہ شامی نہیں سمجھ سکتے، شامی، عراقی پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے، اور مغاربہ کی زبان مشارقہ نہیں سمجھ سکتے، وہ تو بہت ہی بدلی ہوئی ہے، لیکن قرآن کی زبان آج دنیا کے ہر گوشے میں سمجھی جاتی ہے، اسی قرآنی زبان میں تصنیف و تالیف ہو رہی ہے، اسی قرآنی زبان میں عجمی لکھ رہے ہیں اور عجمی اپنا لوہا منواتے ہیں عربوں سے، جن کی یہ زبان ہے، جو زندہ ہے اور دنیا کے ہر گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

قرآن کا صدقہ

مجھے بعض موقعوں پر عربوں کی نمائندگی کرنی پڑی، بعض اہم جلسوں میں، مدینہ طیبہ میں ایک جلسہ ہو رہا تھا مؤتمر الدعوۃ کا، اس میں سیکڑوں علماء مصر و شام کے اور مغرب اقصی مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک، امریکہ سے لے کر پاکستان تک کے لوگ موجود تھے، خدا

جانے کیا بات تھی کہ ان لوگوں نے میرا انتخاب کیا کہ میں ترجمانی کروں وفود کی، یہاں ایک روایت یہ ہے کہ یہاں جو جلسے ہوتے ہیں، جو پروگرام ہوتے ہیں، ان میں ایک آئیٹم یہ ہوتا ہے کہ جو بڑے بڑے مہمان آئیں مختلف ملکوں کے، ان کی طرف سے ایک آدمی نمائندہ ہو اور وہ بولے، مجھے آواز دی گئی، میں اسٹیج پر پہنچا، چوٹی کے علماء موجود تھے، مصر کے علماء موجود تھے، ازہر کے علماء موجود تھے، ممالک عربیہ کے علماء موجود تھے، میں نے کہا: آج ایک عجمی کو مدینہ طیبہ میں اتنی بڑی مؤتمر میں اس اسٹیج پر صرف قرآن مجید کے طفیل میں بلایا گیا ہے، اگر یہ قرآن مجید نہ ہوتا تو ایک ہندی کی ہرگز یہ جرأت نہ ہوتی اور نہ کسی کا ذہن اس طرف جاتا کہ کسی ہندی کو بلایا جائے ترجمانی کرنے کے لیے، یہ قرآن مجید کا صدقہ ہے، یہ صرف قرآن مجید کا معجزہ ہے کہ ایک ہندی کو آپ علمائے عرب کی طرف سے، وہ ہندی، وہ بے چارہ کہاں، عربی سے اس کا کیا رشتہ، وہ سات سمندر پار رہنے والا، وہ اگر اردو ہی اچھی جانے تو کمال ہے، اس زمانہ میں، وہ عربی زبان میں اپنے خیالات کے اظہار پر قادر ہو، عربوں کو خطاب کر سکے، یہ صرف قرآن مجید کا صدقہ ہے، اور قرآن مجید کا معجزہ ہے، اور میں نے دیکھا کہ عربوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے آنسو پوچھنا شروع کیے اور کہنے لگے کہ ہندی نے صحیح کہا، ہندی نے سچ کہا، میں نے کہا کہ آپ قدر کریں، اللہ تعالیٰ نے اگر آپ کو یہ اسلام کی دولت نہ دی ہوتی، یہ قرآن مجید کی دولت نہ دی ہوتی، تو آج ہندوستان میں آپ اپنی عربی زبان کو نہیں پہنچا سکتے تھے، آپ کی پچاس سلطنتیں ہوتیں، آپ کا جھنڈا ساری دنیا پر اڑتا رہتا لیکن آپ کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ ایک ہندی سے آپ عربی بلوا لیتے، یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ ایک ہندی سے عربی میں بلوا رہا ہے، آپ کے سامنے بلوا رہا ہے، اور جادو وہ ہے جو سر پر چڑھ کر بولے کہ میں مدینہ طیبہ میں کھڑے ہو کر یہ جرأت کر رہا ہوں، ایک طالب علم ایک معمولی مدرسے کا، جس کے کپڑے آپ کے نوکروں کے کپڑوں سے کم ہیں۔

آج اس کو یہ عزت جو ملی ہے، رسول اللہ (ﷺ) کے مرقد مبارک اور روضۂ انور سے چند گز کے فاصلے پر، ایک ہندی غلام کو یہ جرأت ہو رہی ہے کہ خالص قرآن کی زبان میں آپ کو خطاب کر رہا ہے، یہ صرف قرآن کا معجزہ ہے، اور یہ صرف اسلام کا صدقہ ہے، میں

نے دیکھا کہ لوگوں نے سر تسلیم خم کردیے، اپنے سر جھکا لیے اور لوگوں نے رونا شروع کیا کہ ہندی نے سچ کہا۔

دنیا کے مسلمانوں کی حفاظت کا راز

میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ کی تفسیر میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ عربی زبان بھی قیامت تک جب تک اللہ کو منظور ہے اسلام کو رکھنا اور قرآن مجید کو، یہ عربی زبان اسی قرآنی صرف ونحو میں، اسی قرآنی قواعد میں، اسی قرآنی زبان میں باقی رہے گی، ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ کے اندر یہ بھی آتا ہے کہ قرآن محفوظ، قرآن کی زبان بھی محفوظ، قرآنی زبان کی صرف ونحو بھی محفوظ، قرآنی زبان کے بولنے والے بھی محفوظ، جن ملکوں میں یہ زبان بولی جاتی ہے ان کے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت اس آیت میں ہے، یہ اقوام متحدہ کے منشور میں نہیں ہے، یہ یونائٹیڈ نیشن کے اعلانات میں نہیں ہے، یہ صدر کارٹر کے کسی بیان میں نہیں ہوسکتی، روس کے کسی صدر کے یہاں نہیں ہوسکتی، یہ صرف ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ کے اندر مضمر ہے، میں نے کہا کہ آپ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیے، آپ اطمینان سے بیٹھے رہیں، آپ فکر نہ کریں، آپ کی حفاظت کی ضمانت دی ہے، بلکہ میں ایک قدم اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ مختلف ممالک کے مسلمان بھی اسی حالت میں محفوظ اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہمارے ساتھ ہیں، حفاظت کی ضمانت ہمارے ساتھ ہے جبکہ ہم قرآنی علوم اور قرآنی تعلیمات کو سینے سے لگائے رکھیں، ان کی نشر و اشاعت، ان کی خدمت، ان کے درس وتدریس، ان کے تعلیم وتعلم کا اہتمام کریں گے، آج ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے، وہ نہیں جو وزیراعظم کبھی کبھی دیتی ہیں، جو کبھی کبھی آپ کو سیاست کے ایوانوں سے ملتی ہے، وہ نہیں جو کبھی کبھی الیکشن کے منشور میں آتی ہے اور جو مینی فیسٹو میں شائع کی جاتی ہے کہ اقلیتوں کے محافظ ہم ہیں، اقلیتوں کے محافظ، بشرطیکہ اقلیت خود اپنی محافظ ہو، اور ان تعلیمات آسمانی کی محافظ ہو، غیور ہو، خود دار ہو، یہ ضمانت صرف اللہ کی طرف سے ہے، ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ ''ہم ہی اس کی حفاظت کرنے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کا محافظ ہے

ہندوستانی مسلمانو! ہمارے کانپور کے بھائیو! سارے سامعین! آپ سن لیں کہ وہ مدارس جو قرآن مجید کی زبان سکھا رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں، قرآن مجید یاد کرا رہے ہیں، جن چیزوں پر قرآن مجید کا سمجھنا اور اس کا علم موقوف ہے، ان علوم کی تعلیم دے رہے ہیں، یہ عربی رسم الخط پھر اس کے بعد یہ صرف ونحو، یہ علم بلاغت ومعانی، پھر یہ فقہ واصول فقہ، یہ تفسیر و حدیث، یہ ساری چیزیں جب تک کہ ہم ہندوستانی مسلمان ان ساری چیزوں کو سینے سے لگائے رکھیں گے، اور ہم ان کی قدر کریں گے، اور جن لوگوں کے سینوں میں اور جن لوگوں کے سفینوں میں یہ چیزیں ہیں، ہم ان کی قدر کریں گے، ان کا احترام کریں گے، ان مدرسوں کا احترام ہمارے دلوں میں ہے، دینی تعلیم کا احترام ہمارے دلوں میں ہے، علوم اسلامیہ کا احترام ہمارے دلوں میں ہے، اور وہ علماء جو ان کے حامل ہیں، ان کا احترام ہمارے دلوں میں ہے، بلکہ ان طلبہ کا احترام بھی ہمارے دلوں میں ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں معاشی ترقیوں سے، ان کے والدین نے یا خود انھوں نے اپنی عمر کے مطابق ان تمام معاشی ترقیات ومفادات سے آنکھیں بند کر کے اپنی زندگیاں وقف کی ہیں قرآن مجید کے سمجھنے کے لیے، اور قرآن مجید کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے، ان کی قدر اور ان کا احترام بھی ہمارے سینوں میں ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس مسلمان ملت کا محافظ ہے تو ساری دنیا اگر چاہے، ساری دنیا اگر اس کا بال بیکا کرنا چاہے، تو وہ کچھ نہیں کر سکتی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ ''ہم اس قرآن کے محافظ ہیں''، تو اس کے حاملین کے بھی محافظ ہیں، یہ نہیں ہوسکتا کہ اذان رہے، مؤذن نہ رہے:

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلمان کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرّ کلیم وخلیل

اگر اذانیں مطلوب ہیں، تو مؤذن ضروری ہیں، مؤذن ضروری ہیں تو مسجدیں ضروری ہیں، مسجدیں ضروری ہیں تو ان کا بنانا، ان کا آباد رکھنا بھی ضرری ہے، یہ پورا ایک سلسلہ ہے، ایک زریں کڑی ہے، جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوست ہے، آپ ان مدرسوں کو اس

نظر سے نہ دیکھیں کہ ان میں کچھ ایسے لوگ جو دنیا کے کسی کام کے نہیں، ان میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں، ان کے والدین نے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی قربانی کی طرح ان کو قربان کر دیا ہے، اور یہاں ڈال دیا ہے، آپ ان کو اس نظر سے نہ دیکھیں۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

کشتیِ نوح

آپ یہ نہ دیکھیں کہ یہ کیا کھا رہے ہیں، کیسی عمارتوں میں رہتے ہیں، ان کا مستقبل کیا ہے، آپ یہ دیکھیں کہ وہ کس مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں، وہ مقصد وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم نے ''الذکر'' قرآن مجید کو نازل کیا، اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، اس کی حفاظت کر کے رہیں گے، ساری دنیا ایک طرف ہو تو کچھ نہیں ﴿إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾ [سورة يس:۸۲]

اس کا تو بس کُنْ کہہ دینا کافی ہے، اس ﴿وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ﴾ میں ساری ضمانتیں اور حفاظتیں ہیں، اس لیے مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے کو اس سلسلے میں داخل کریں، اس کشتیِ نوح میں اپنے کو بٹھا دیں، میں کشتیِ نوح کہتا ہوں کہ ﴿لَا عَاصِمَ ٱلْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ ٱللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ﴾ [سورة هود:۴۳]، ایک ہی جگہ تھی طوفان نوح میں بچنے کی، اور وہ نوح (علیہ السلام) کی کشتی تھی، اس وقت بھی اگر کوئی جگہ ہو سکتی ہے، اس وقت آپ دیکھ لیجیے ایک سیلاب امڈا چلا جا رہا ہے، ساری دنیا پر مادیت کا، نفس پرستی کا، خواہش پرستی کا، قوت پرستی کا، طاقت پرستی کا، یہ سب کو لے ڈوبے گا، اس وقت کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے، پناہ کی جگہ ہے تو اُس وقت کشتیِ نوح تھی، اور اِس وقت کشتیِ محمد (ﷺ) ہے، کشتیِ اسلام ہے، کشتیِ قرآن ہے، اور دیکھنے والے دیکھ لیں گے اگر کوئی اس زمانہ میں کوہ جودی کی تلاش کرے گا، تو پسر نوح کنعان کی طرح اس کا وہی انجام ہوگا جو پسر نوح کا ہوا تھا، اور نوح (علیہ السلام) کی جو آواز اس وقت فضائے آسمانی میں دریا کے تلاطم میں بلند ہوئی تھی کہ ﴿لَا عَاصِمَ ٱلْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ ٱللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ﴾ ''بیٹا! اس وقت کوئی اللہ کے عذاب سے بچا نہیں سکتا، سوائے

اس کے جو اس کشتی میں بیٹھ جائے، اس کشتی میں پناہ لے اور جس پر اللہ رحم کرے،" تو آج بھی اگر کوئی سمجھ رہا ہے کہ کوہ جودی ہے، تو وہ کان کھول کر سن لے کہ جب طوفان نوح آئے گا تو کوئی پناہ کی جگہ نہ ہوگی، ہم آپ تو کیا چیز ہیں، چھوٹے چھوٹے ممالک کیا چیزیں ہیں، امریکہ اور روس کو بچانے والا کوئی نہیں، اگر زندگی ہے، اور وہ وقت آیا جو آنے والا ہے اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿أَزِفَتِ الْآزِفَةُ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ﴾[سورۃالنجم:۵۸]

"آنے والی قریب کی چیز آ گئی، اللہ کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں۔"

اگر ہم آپ زندہ رہے تو دیکھیں گے کہ یہ آلات سائنس کی ترقی اور یہ فتوحات، یہ کامیابیاں اور خوشحالیاں، اور یہ دوسرے ملکوں پر اقتدار و تسلط کچھ کام نہ آئے گا، اس وقت بھی کشتی ایک ہوگی، جو اس میں جگہ حاصل کر لے گا، اپنی جگہ بنا لے گا، وہی بچے گا۔ مسلمانوں کی حفاظت کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے، کوئی بالشت برابر جگہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم قرآن مجید کے سائے کے نیچے آئیں، جس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے، اس کے سائے میں جو بھی آ جائے گا، وہ محفوظ ہو جائے گا، جس کشتی کو بچانے کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، جو اس کشتی پر بیٹھ گیا وہ بچ گیا، ایسے میں جو اس قرآن مجید کے سائے میں آئے گا، اور سمجھے گا کہ محافظ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، یہ سمجھے گا کہ اسلام سے لپٹے رہنے میں، اس سے چمٹے رہنے میں ہی ہماری حفاظت ہے، وہی بچے گا، اس کے علاوہ کوئی بچنے والا نہیں، یہ تدبیریں، یہ ذہانت، یہ ترقی اور دولت، یہ جمہوری حکومتیں اور یہ سیاسی جدوجہد کوئی بچانے والی نہیں، جب آسمان سے کوئی چیز آئے گی تو زمین کی کوئی تدبیر کام نہیں کرے گی، اس وقت آسمان والی ہی تدبیر کام آئے گی، آسمان والی مصیبت سے بچانے کے لیے آسمان والے ہی کی بتائی ہوئی تدبیر کام آئے گی، زمین والوں کا ہاتھ پاؤں مارنا، زمین والوں کی ذہانت یہ سب کچھ کام نہ آئے گا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کا راز

ہم کو اور آپ کو یقین کرنا چاہیے کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کا راز اپنی تمام تر

کمزوریوں اور بے سروسامانیوں کے باوجود، ان سخت طوفانوں کے اٹھنے کے باوجود جو وقتاً فوقتاً اٹھتے رہتے ہیں، اور مختلف وقتوں میں یہاں جو زلزلے آتے رہتے ہیں، ان سب کے باوجود ہمارے تحفظ کا راز، ہماری صیانت اور حفاظت کا راز قرآن کی بقا میں ہے، قرآن مجید کی تعلیمات کی بقا میں ہے، اور اس پر عمل کرنے میں ہے، اور اپنی طرف سے اس کی حفاظت و اشاعت میں ہے۔ ہم اس قرآن مجید کی حفاظت و اشاعت کے کام میں جتنے سرگرم ہوں گے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری حفاظت کا سامان کیا جائے گا۔ ہمارا تحفظ اس میں نہیں ہے جس میں ہم نے سمجھا ہے، میں ان چیزوں کی افادیت کا منکر نہیں ہوں، میں تو ان لوگوں میں ہوں، ابھی کانپور ہی میں دو اسکولوں کا میں نے سنگ بنیاد رکھا اور کہا کہ بچوں کو الحاد سے بچانے کے لیے اور عیسائیت کے اثرات سے بچانے کے لیے، کھلی بت پرستی کے اثر سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے اسکول قائم کیے جائیں جو انگلش میڈیم ہوں، چاہے کسی معیار کے ہوں، ان میں دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے، ان میں مسلمان اساتذہ ہوں، انھیں کے زیر انتظام ہوں تاکہ مسلمانوں کے عقائد اور مسلمانوں کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں وہ بتائی جائیں، میں تو ان لوگوں میں ہوں جو ان کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن یہ دینی مدارس یہ ہماری حفاظت کے قلعے ہیں جیسے کہ پہلے قلعے ہوا کرتے تھے، جن سے جب بڑی فوجیں آتی تھیں تو ان سے دفاع کیا جاتا تھا، اور حفاظت کا سامان ہوا کرتا تھا، اس زمانے میں وہ قلعے اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔

اسلام کے قلعے

لیکن یہ زمینی قلعے جن کا نام مدارس ہے، میں نے ایک پورا سلسلۂ مضامین اس سلسلے میں لکھا تھا، ''اسلام کے قلعے'' کے نام سے، جو رسالہ ''الندوہ'' میں اور ''الفرقان'' میں کئی مہینہ شائع ہوتا رہا، اور اب بھی میں اس عقیدے پر قائم ہوں کہ ہمارے یہ مدارس اسلام کے قلعے ہیں، ان سے ملت اسلامیہ کی حفاظت ہوگی، جو کشش مجھے یہاں کھینچ کر لائی ہے اس مدرسہ کی افادیت ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ محترم حاجی منت اللہ صاحب کو میں نے جوش دلایا

اوران کو ہمت دلائی کہ آپ بددل نہ ہوں اہل کانپور کی سرد مہری سے، اوران کے عدم تعاون سے آپ دل برداشتہ نہ ہوں، آپ اس مدرسہ کو قائم رکھیں، آپ کے قریب ہی ندوۃ العلماء ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے قریب کے مدرسوں کی ہم جو بھی خدمت کرسکیں گے بلکہ سارے ہندوستان میں اگر ہمارے امکان میں ہوتو ان مدارس کا جال پھیلا دیں، جیسا کہ ہمارے اسلاف نے ایک زمانہ میں مدارس قائم کیے تھے، اوران کی وجہ سے آج آپ دیکھ لیجیے ہمارے ہندوستانی مسلمانوں میں کتنی خصوصیتیں ہیں جو ان ملکوں میں نہیں پائی جاتیں جن کی مادری زبان عربی ہے، جن کا عام آدمی بھی قرآن مجید ہمارے اچھے سے اچھے علماء سے اچھا پڑھ سکتا ہے، لیکن آج ان میں وہ دینی حمیت، وہ اسلامی غیرت، وہ اسلامی احکام اور وہ جماعتوں کی پابندی اور وہ دین کی اشاعت کا جذبہ اور وہ دینی شعائر کا احترام ان کے اندر نہیں ہے، اس کے باوجود اور بہت سی خصوصیات ہیں جن کا میں احترام کرتا ہوں، اور سب کو احترام کرنا چاہیے، ان میں وہ خصوصیات نہیں ہیں، وہ تمدنی، معاشرتی، اسلامی بہت سی خصوصیات ان میں باقی نہیں ہیں جو ہم گئے گزرے ہندوستانیوں میں موجود ہیں، یہ سب کس کا فیض ہے؟ یہ سب صرف ان عربی مدارس کا فیض ہے، یہ یقیناً دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور اور ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور جامع العلوم کانپور اوران قدیم مدارس کا فیض ہے جو ہمارے اسلاف نے ہندوستان کے چپہ چپہ پر قائم کیے اوران سے وہ علماء پڑھ کر نکلے جنھوں نے دنیا سے بالکل آنکھیں بند کرلیں۔

ایک مرتبہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی جو ساری دنیا دیکھ چکے تھے، بڑے جہاں بین اور مبصر تھے، انھوں نے کہا کہ خدا تعالیٰ ہمارے علمائے کرام کو، ان بانیان مدارس کو جزائے خیر دے جنھوں نے ایسے لوگ تیار کیے جو دنیا کے کسی کام کے نہ تھے، اگر وہ دنیا کے کسی کام کے ہوتے تو ہندوستان میں اسلام اس طرح نہیں محفوظ رہ سکتا تھا، اس لیے کہ جو لوگ دنیا کے کام کے تھے ان کو ہم نے مصر و شام میں دیکھا ہے، وہ دنیا کے کام میں لگ گئے، لیکن ان علماء نے ایسے اللہ کے بندے پیدا کیے جو دین کی خدمت نہ کریں گے تو اور کیا کریں گے، ان کی روٹی بھی دین کی خدمت سے وابستہ کردی اللہ نے، تو دین بھی رہا اور وہ بھی رہے۔

عربی مدارس کی ترقی اور توسیع کی ضرورت

یہ عربی مدارس بے شک ان کو اس وقت بہت زیادہ ترقی کی ضرورت ہے، بہت توسیع کی ضرورت ہے، بعض چیزوں میں اصلاح کی ضرورت ہے، اور ہم اس کے داعی ہیں، اور داعی رہیں گے، ہم اس موقف پر ہیں کہ ہمیشہ جائزہ لیتے رہیں مدارس کا اور جن چیزوں کی ضرورت ہو، اسلام کے اصول، کتاب وسنت کے رہنما اصول کی روشنی میں ان کا اضافہ کرتے رہیں، اس کے باوجود یہ جیسے کچھ بھی مدارس ہیں، جہاں چٹائیوں پر لوگ پڑھتے ہیں، یا جو اتنے ترقی یافتہ نہیں ہیں جیسے اور بڑے بڑے مدارس ہیں، یہ سب غنیمت ہیں، ایک بہت بڑی نعمت ہیں، ان کی وجہ سے اسلام آج ہندوستان میں اپنی خصوصیات کے ساتھ قائم ہے، آپ حج میں جاتے ہیں اور دنیا کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں اور آپ کو بھی یہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم اس برصغیر کے مسلمانوں کو اپنے کتنے بڑے کرم سے نوازا ہے، آج اس گئی گزری حالت میں اور اس دور مادیت اور ہندوستان میں جو انقلابات آتے ہیں، سیاسی بھی غیر سیاسی بھی، ان کے باوجود بھی یہاں اسلام کی شکل وصورت، دین کی شکل وصورت کتنی پائی جاتی ہے، اور پھر یہ تبلیغی جماعت اور تبلیغی کوششیں اسی ہندوستان سے شروع ہوئیں، یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟ کون اس کے شروع کرنے والے تھے؟ کیا کہیں باہر سے آئے تھے؟ نہیں! یہ مدارس کی چٹائیوں پر بیٹھنے والے مولانا الیاس صاحب کون تھے؟ یہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے ایک طالب علم تھے، یہیں کے استادوں سے انھوں نے پڑھا ہے، اور آج بھی جن لوگوں کے ہاتھ میں قیادت ہے، اور آج بھی وہ ساری دنیا کو دعوت دے رہے ہیں، اور انہی تاریخوں میں وہاں امریکہ میں اتنا بڑا اجتماع ہوا تبلیغ کا، اس کے اصل داعی کون ہیں؟ یہی ہمارے مدارس کے، مولانا محمد عمر صاحب کون ہیں، جو آپ کے کانپور کو آکر ہلا جاتے ہیں؟ اور پھر میں نے سنا ہے کہ دسمبر میں آپ کے یہاں بڑا اجتماع ہونے والا ہے، یہ کون ہیں؟ دارالعلوم دیوبند کے ایک طالب علم، اور ان کے ساتھ جو دوسرے معاون ہیں، وہ کون ہیں؟ کوئی دارالعلوم دیوبند کا ہے، کوئی ندوۃ العلماء کا ہے، کوئی مظاہر علوم کا ہے۔

بھائیو! ان مدارس کو قائم رکھیے، ان کی خدمت کو اپنی حفاظت کا ذریعہ سمجھئے، میرے اس

آیت کے پڑھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ یہ سمجھیں کہ آپ کی حفاظت مادی خوشامدوں میں نہیں ہے، حکام کو خوش کرنا، وزیروں کو خوش کرنا، ان کی خوشی کے لیے جلسے کرنا، دعوتیں کرنا، آنکھ بند کرکے پانی کی طرح اس میں روپیہ بہانا، اس میں آپ کی حفاظت نہیں ہے، اور نہ یہ چیزیں آپ کی حفاظت کرسکیں گی، آپ نے خود دیکھ لیا کہ یہ چیزیں آپ کی حفاظت نہیں کرسکیں، آپ کی حفاظت دین کے مضبوط کرنے میں ہے، دین کو مضبوط پکڑنے میں ہے، اور جہاں سے دین ملتا ہے اور جن سے دین ملتا ہے، ان کا احترام اور ان کے ساتھ تعاون کرنے میں ہے، ان کا ہاتھ مضبوط کرنے میں ہے۔

اہل کانپور پر ندوۃ العلماء کا حق ہے

بس میں اپنی بات ختم کرتا ہوں، شکر ہے کہ اس اندھیرے میں اور آواز نہ پہنچنے کی حالت میں بھی آپ بیٹھے رہے، یہ آپ کے دینی جذبے کی، دینی قدر کی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے، پھر اللہ تعالیٰ نے روشنی بھی بھیج دی، ہوا بھی بھیج دی۔

اب میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ مدرسہ آپ کی ذمہ داری پر ہے، ہماری بڑی ذمہ داری ہے، اور ہم اسے بڑی سعادت سمجھتے ہیں، ہم ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے بڑی سعادت سمجھتے ہیں کہ جو کچھ اس کی خدمت کرسکیں کریں، لیکن اصل ذمہ داری کانپور والوں کی ہے، اور ندوۃ العلماء کی تحریک ہی کانپور سے اٹھی تھی، یہ آپ کو معلوم ہے، ندوۃ العلماء کی تحریک میں ہم سب کا انتساب ہے، جو آج الحمد للہ دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی ہے، اور جس کا اتنا بڑا تعلیمی اجلاس ابھی چند سال پہلے ہوا، یہ مدرسہ فیض عام کی چٹائیوں پر اور مدرسہ فیض عام کے چھوٹے سے ماحول کے اندر یہ خیال پیدا ہوا، مولانا محمد علی مونگیری (رحمۃ اللہ علیہ) کے ذہن میں اور ان کے چند رفقاء کے ذہن میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈالی، اور پہلا اجلاس ندوۃ العلماء کا جو ہوا ہے اور جس سے داغ بیل پڑی ہے، وہ یہیں مدرسہ فیض عام میں ہوا اور اسی کانپور میں ہوا، اور عرصہ تک ندوۃ العلماء کا دفتر کانپور ہی میں رہا، کئی برس کے بعد لکھنؤ منتقل ہوا۔

اس لیے اگر آپ ندوۃ العلماء کی کوئی بڑی خدمت نہ کر سکے، حالانکہ آپ کی زمین پر، آپ کے شہر پر حق قائم رہے گا ندوۃ العلماء کا، آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں آج یہ حق منتقل کرتا ہوں اس چھوٹے سے مدرسہ کی طرف کہ کم سے کم اس کو تو اگر آپ وہاں تک نہ پہنچ سکیں اور آپ کہیں کہ وہ اب ایک عالم گیر چیز ہو گیا، سارے عالم اسلام پر اس کا حق ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اچھا! میں نے ندوۃ العلماء کے ایک چھوٹے سے حصے کو آپ کو دیا، اور آپ کی طرف منتقل کیا، اور یہ ہے وہ مدرسہ جس کے میدان میں آپ اس وقت جمع ہیں، کم سے کم اس کی خدمت کی ذمہ داری تو آپ لیجیے، ہم بے شک اس سے عہدہ برآ نہیں ہوتے، اور جب ہم کو یاد کیا جائے گا اور سال بھر ہمارا اس سے تعلق باقی رہے گا۔

حضرات کانپور کے خواص! آپ کے اوپر اس مدرسہ کا حق ہے کہ یہ باقی رہے، آپ اسے ترقی دیں، آپ کے ساتھ ان شاء اللہ تعلیمی نصابی طریقے پر، تربیتی طریقے پر، آپ کا تعاون کروں گا، ابھی آپ نے یہاں کے بچوں کو تقریر کرتے ہوئے سنا، اس کے ترجمہ کی بھی آپ نے عمدہ طریقے پر سماعت کی، اور جو پروگرام ہوئے ان کا مشاہدہ کیا، یہ سب چند سال کی محنت کا نتیجہ ہے، اگر آپ کا تعاون باقی رہا، جاری رہا، تو ان شاء اللہ دیکھیں گے کہ ایک چھوٹا سا ندوۃ العلماء یہاں بن جائے گا۔ (۱)

---

(۱) مدرسہ دار التعلیم والصنعت، جاجمئو، (کانپور) کے جلسۂ تعلیمی میں ۳۰/ جون ۱۹۸۰ء کو کی گئی ایک تقریر، ماخوذ از پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ، (شمارہ ۱۰ و ۲۵/ اکتوبر ۱۹۸۰ء)۔

مدارس اسلامیہ کی خصوصیات

بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله و سلام على عباده الذين اصطفى، أما بعد!

حضرات! کسی ادارے کے کارکن، ذمہ دار، یا کسی تحریک کے ہم نوا اور درد مند کے لیے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات، اور بلکہ موجب شکر چیز ہوتی ہے کہ جو بات اس کو کہنی ہے، وہ باتیں اللہ تعالیٰ اس کے رفقائے کرام اور مدعووین عظام کی زبان سے ادا کروائے، جو داعی یا کسی درجہ میں ذمہ دار آدمی کے خیالات سے اتفاق رکھتی ہوں۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں اور اللہ کا مجھے شکر ادا کرنا چاہیے کہ مجھے جو باتیں کہنی چاہیے تھیں، وہ باتیں ان فضلاء کی زبان سے نکلیں۔

دو اصطلاحیں

میں بڑے علماء کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، متاثر ہوکر جو ہمارے قدیم نصاب کے پڑھانے والے ہیں، دو اصطلاحیں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، ایک سلبی، ایک ایجابی۔ یہ دنیا کا کارخانہ سلبیت اور ایجابیت پر چل رہا ہے، سلبی چیز کے پہلو سے متعلق تو بہت کچھ کہا گیا اور اس کا حق تھا کہنے کا، اور اس میں یہ بات جو ضرور یاد رکھنے کی اور قبول کرنے کی ہے، اس پر عمل کرنے کی بھی ہے کہ مسئلہ کو کوئی ایسا سیاسی رنگ نہ دیا جائے، فرقہ وارانہ شکل میں اس کو پیش نہ کیا جائے کہ اصل مقصود تو گم ہو جائے اور فراموش ہو جائے، اور پھر ایک نبرد آزمائی اور محاذ آرائی شروع ہو جائے، کہ جس سے نہ ملک کو فائدہ پہنچے گا نہ مدارس کو۔

اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت

اور یہ میں آپ کے سامنے بڑی معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ دین کے داعیوں، یا

ملت کے خادموں میں جو اخلاص ہونا چاہیے، اس اخلاص کو حاصل کرنے کی کوشش کی ضرورت ہے، اور افسوس ہے کہ مشائخ کرام اور مصلحین عظام اور ان علمائے ربانیین کی کمی ہوگئی ہے کہ جو ہر بات کو اس نیت کے ساتھ کرنے کی تعلیم دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ امور طبعیہ کے بارے میں ان کی تعلیم یہ تھی کہ اس میں رضائے الٰہی کی نیت ہو، اور وہ عادتاً نہ کیے جائیں۔

اور میں اس موقع پر معذرت کے ساتھ ایک شہادت پیش کردوں کہ حضرت سید احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہ) کہ جن کا آپ نے نام سنا ہوگا، میں نے ان کے فرمودات میں اور ان کے ملفوظات میں اُن کا یہ جملہ پڑھا کہ جب سے شعور پیدا ہوا ہے، سوچنا سمجھنا آیا ہے، اس وقت سے اس وقت تک (معلوم نہیں یہ بات اس وقت کہی گئی جب حضرت کا سن مبارک تیس سال کا تھا، چھیالس سال کل عمر ہوئی، چھیالس سال کی عمر میں شہادت پائی) اس وقت سے لے کر اس وقت تک سونا جاگنا، کپڑے پہننا، کھانا کھانا، قضائے حاجت کرنا، دوستوں سے ملنا، استقبال کرنا، کوئی امر بھی اس وقت تک مجھ سے ایسا نہیں ہوا جس میں رضائے الٰہی کی نیت نہ رہی ہو، اور ایمان واحتساب شامل نہ ہوا ہو۔

ایمان واحتساب

اور آپ کو معلوم ہے کہ ایمان واحتساب کی شرط ان چیزوں کے ساتھ بھی لگائی گئی ہے جن کے بارے میں ایک سلیم الفکر آدمی سوچتا ہے کہ اس شرط کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام کرتا کون ہے؟ یہ کام کیا کس لیے جاتا ہے؟ رضائے الٰہی کے لیے کیا جاتا ہے! لیکن سید البشر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ (ﷺ) کی بصیرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ منکشف کیا، اور یہ بصیرت صرف مسائل فقہیہ میں یا احکام دینیہ میں محدود نہیں تھی، بلکہ یہ اس سے بہت زیادہ وسیع تھی، کہ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّ احْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيْمَانًا وَّ احْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، ''جس نے رمضان روزے رکھے ایمان واحتساب کے ساتھ، اللہ کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے اور اس کے اجر وثواب کی لالچ میں، اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہوگئے،'' تو اگر کوئی پوچھتا کہ رمضان کے روزے رکھتا کون ہے؟ کون رکھے گا؟ اس

کا دافع کیا ہے؟ اس کا محرک کیا ہے؟ اس کا باعث کیا ہے؟ وہ اللہ کی رضا ہی کے لیے روزے رکھتے ہیں، لیکن آپ کو جن کو اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کے لیے، اور قیامت تک کے لیے نبی بنا کر بھیجا، اور معلم بنا کر بھیجا اور مربی بنا کر بھیجا، اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ نکتہ فاش کیا، آپ کو القاء فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ رمضان کے روزے رکھے جائیں اور نیت ثواب کی بالکل نہ ہو۔

ایک لطیفہ

میں اس موقع پر ایک لطیفہ- اگرچہ اس موضوع سے ہٹ کر ہے- سنادوں کہ میری ایک تقریر یہاں سے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ ہوئی، میں اس وقت شمالی ہند کے کوئٹہ اور افغانستان کی سرحد تک گیا ہوا تھا، میں اس دن کوئٹہ میں تھا، اس دن کی وہ تقریر یہاں سے نشر ہوئی، اور اس میں مَیں نے روزے کے محرکات اور فوائد اور دینی فضائل بیان کیے تھے، اسی دن وہاں کے ایک بڑے فوجی افسر کے یہاں دعوت تھی، میں بھی تھا اور مولانا منظور صاحب نعمانی بھی تھے، تو وہاں داعی صاحب نے ہم سے کہا کہ میں ابھی آپ کی تقریر سن کر آیا ہوں، اور مجھے بڑی پسند آئی، آپ نے بڑے کام کی باتیں کہیں، لیکن ایک بات چھوٹ گئی، آپ نے رمضان کے روزے رکھنے کے فوائد بتائے ہیں، لیکن ایک فائدہ نہیں بتایا، وہ یہ کہ روزہ کھولنے سے جو لطف آتا ہے، جو لذت آتی ہے، وہ کسی چیز میں نہیں آتی، اور میں تو روزہ رکھتا ہی اسی لیے ہوں کہ روزہ کھولنے میں، اس وقت پانی پینے میں یا شربت پینے میں یا کچھ کھانے میں اس وقت جو لطف ہے وہ کسی چیز میں نہیں۔

آج دینی وملی کاموں میں اخلاص کی کمی ہے

تو میں اس لیے یہ عرض کررہا ہوں کہ اس چیز کی ملت میں کمی ہے، اور خاص طور پر- مجھے معاف کیا جائے- جب جدید حالات میں ذہن کی تشکیل ہوتی ہے اور سیاسی مسائل سامنے آتے ہیں، تو بعض اوقات بالکل یہ بات فراموش ہوجاتی ہے کہ یہ کام ہم اللہ کی رضا کے لیے کررہے ہیں اور ملت کے کسی شعبہ یا ملت کے کسی کام اور مقصد کی تقویت کے لیے اور اس

کی کامیابی کے لیے کر رہے ہیں، اس میں بعض مرتبہ اپنی قیادت اور کم سے کم اپنی مجلس کا علمِ قیادت بلند کرنے کا جذبہ شامل ہو جاتا ہے، تو حتی الامکان اس مسئلہ سے بچانا ہے، مولانا سالم صاحب- مدظلہ ونفع اللہ بہ- نے جو بات بہت تفصیل کے ساتھ کہی، میں اس سے اتفاق رکھتا ہوں، کہ اس مسئلہ کو ایک دینی مسئلہ کی حیثیت سے اور ایک عبادت کے طور پر اور پھر آگے بڑھ کر میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ حفاظت دین کی نیت سے اس کو کرنا چاہیے، اور اس میں خطرہ ہے، اگر یہ چیز نوجوانوں کے پاس پہنچ گئی اور مختلف سیاسی قیادتوں کے حوالے ہوگئی اور تنظیموں کے حوالے ہوگئی، تو پھر اس کا استحصال کیا جا سکتا ہے، اور اس کو پالیٹکل (Political) طریقے پر ایکسپلائٹ (Exploit) کیا جا سکتا ہے، کہ اس سے اپنی تنظیم کی افادیت اور ملت میں اس کی اہمیت اور عظمت اور اس کی انفرادیت ثابت کی جائے، اس لیے اس مسئلہ کی مصلحت یہ ہے اور دین اور ملت کی بھی مصلحت یہ ہے کہ اس کو اجر و ثواب کی نیت سے کیا جائے، حفاظت دین کی نیت سے کیا جائے۔

اس ملک میں اس ملت کے اعتقادی طور پر، ذہنی طور پر، اور عملی طور پر، اور ثقافتی طور پر، تہذیبی طور پر، فکری طور پر اس کے ایک مشخص معین، ملت حامل کتاب وسنت کی حیثیت سے رہنے کے لیے کام کیا جا رہا ہے، اس لیے میں یہ عرض کروں گا، -ان خدمات اور کارناموں کی قدر کرتے ہوئے جو اس وقت تک ہماری سیاسی تنظیمات یا مختلف قیادتوں کے ذریعہ سے ظہور میں آئے، میں ان کا پورا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہوں گا- کہ اس مسئلہ کے لیے یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس کو خالص حفاظت دین کے لیے کیا جائے، حفاظت ملت کے لیے کیا جائے، اور اس کو ایک دین کی خدمت اور ایک خالص، بلکہ میں کہتا ہوں کہ ایک عبادت سمجھ کر کیا جائے، تو ایک بات تو یہ ہے۔

تعلیم یافتہ طبقہ کی معلومات مدارس کے متعلق بہت محدود ہیں

دوسری بات یہ ہے کہ یہ واقعہ ہے، آپ حضرات کو ایک رسالہ [1] پیش کیا گیا ہوگا، اس

(۱) یعنی رسالہ ''دینی عربی مدارس کا تعلیمی، تربیتی اور وطنی کردار، اور ہندوستان کے لیے ان کا باعث افتخار ہونا'' مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، (لکھنؤ) جو اس حادثہ کے بعد لکھا گیا۔

میں تفصیل کے ساتھ میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارا جو قدیم نظام تعلیم ہے، اس سے ہمارے غیر مسلم ہم وطن بھی بالکل ناواقف ہیں اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی معلومات بھی (مجھے معاف کیا جائے) بہت محدود ہیں، یا تقریباً معدوم ہیں، یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان مدارس میں دین کی ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے، نماز پڑھنا سکھایا جاتا ہے، مسائل بتائے جاتے ہیں، اور احکام فقہیہ سکھائے جاتے ہیں، یا عربی زبان سکھائی جاتی ہے، جس سے کہ آدمی معاشی مقاصد بھی حاصل کرسکتا ہے، عرب کے ملکوں میں جاسکتا ہے، خلیج میں اور سعودی عرب میں اور مصر وشام میں جاکر اس سے روزگار حاصل کرسکتا ہے، جیسے کہ اس زمانہ میں انگریزی کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے، لیکن اس نظام تعلیم کا جو مزاج ہے، (اس کو میں مزاج کہتا ہوں)، اور جو اس کا شعار ہے، اس کی جو خصوصیت ہے، غیر مسلم حضرات کو تو میں سو فیصدی کہہ سکتا ہوں اور اپنے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے بارے میں مَیں بہت معذرت کے ساتھ پچاس فیصدی کہہ سکتا ہوں، یا اس سے کم وبیش کہ وہ نہیں جانتے کہ ان مدارس کی خصوصیت کیا ہے؟

مدارس اسلامیہ کی خصوصیات

ان مدارس کی خصوصیت ہے معرفت الٰہی پیدا کرنا، اخلاص پیدا کرنا، ایمان واحتساب کی کیفیت پیدا کرنا، اور شریعت کا احترام پیدا کرنا، اور شریعت کی معرفت، شریعت کی صحیح ترجمانی کی صلاحیت پیدا کرنا، اور پھر آخر میں یہ بات کہتا ہوں کہ کردار سازی (Character Building) جو اس وقت دنیا کی اہم ترین، انسانیت کی اہم ترین ضرورت ہے، جس سے بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک خالی ہیں، آپ میں سے بہت سے حضرات ہوں گے (میں بھی انہیں لوگوں میں ہوں) جو بار بار یورپ اور امریکہ جاچکے ہیں، اور وہاں کے ترقی یافتہ حلقوں میں بیٹھ چکے ہیں، اور وہاں کی یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ سے خطاب کرچکے ہیں، اور الحمد للہ ہمارے یہاں کی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی کتابیں یورپ وامریکہ میں مقبول ہورہی ہیں، پھیل رہی ہیں، اور دنیا میں کم زبانیں ہوں گی جن میں ان کا ترجمہ نہ ہوا ہوگا، میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس وقت جو بہت بڑی کمی ہے، وہ کردار کی کمی

ہے، کیریکٹر کی کمی ہے، کہ اخلاقی استقامت ہو، اور انسانیت کی فلاح و بہبودی کا خیال ہو، اور پھر قربانی کا جذبہ بھی ہو، یعنی یہ چیز تقریباً مفقود ہوتی جارہی ہے۔

دولت پرستی کا جنون

اور اس وقت ملک کے حالات جو اخبارات کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں، اس سے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ بس ایک ہی حقیقت رہ گئی، ساری حقیقتیں معدوم ہوگئی ہیں، یا نَسیاً مَنسِیًّا بن گئی ہیں، کہ جو اصل چیز ہے، اصل جس چیز کی قیمت ہے اور جس پر محنت کرنی چاہیے، وہ دولت ہے، اگر میں یہ کہوں کہ یہ ملک اصلاً دولت پرست ہے، اصلاً پجاری ہے دولت کا، اور ابھی اخبارات میں جو ذمہ دار ترین آدمی جن کو کوئی بلند انسانی کیرکٹر کا نمونہ ہونا چاہیے تھا، جن کو پوری پوری قوم کا مربی اور ان کا محسن ہونا چاہیے تھا، معمار ہونا چاہیے تھا، جن کے متعلق ہمیں یہ سننا چاہیے تھا کہ وہ پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں، اگر یہ اصطلاح قدیم ہے تو میں کہتا ہوں کہ آدھا پیٹ کھاتے ہوئے اور ضرورت بھر کپڑے پہنے ہوئے، گھر کو ان تمام آسودگیوں سے اور ان تمام لذتوں سے محروم کرتے ہوئے، جن کی خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے اور جن کے امکانات اور وسائل جن کو دوسروں سے زیادہ حاصل ہیں، یہاں اس ملک میں حکومت کر رہے ہیں، ان کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات ہو رہے ہیں کہ پڑھنے والے کا سر جھک جاتا ہے ایک ہندوستانی کے ناطے سے، اسی ملک کے ایک باشندہ ہونے کی حیثیت سے، ایک انسان کی حیثیت سے سر جھک جاتا ہے، اور اگر روایت صحیح نہ ہو تو آدمی یقین نہیں کر سکتا کہ اس منصب پر پہنچنے کے بعد یہ لاکھوں اور کروڑ روپے کا غبن ہوا، گھپلے ہوئے اور اس میں شرکت ہے، اور ایک ایک کے حصے میں کروڑ روپے کی دولت آئی ہے، اور اس سے آگے بڑھ کر مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض بعض لوگوں کا حادثہ پیش آیا تو معلوم ہوا کہ ان کے گھر میں اربوں کی دولت تھی، اتفاق سے پورا خاندان حادثہ کا شکار ہوا۔

ایک اہم ضرورت

تو ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم یہ بتائیں کہ ہمارے مدارس میں کسی چیز کی تعمیر ہوتی

ہے؟ کس خلا کی خانہ پری ہوتی ہے؟ کیا چیز عطا کی جاتی ہے؟ سیرت کی کیا تشکیل کی جاتی ہے؟ یہ ساری پستیوں کے باوجود، اخلاقی تنزل کے باوجود، فحش لٹریچر کی اشاعت کے باوجود، اب بھی فطرت انسانی میں کسی خوبصورت چیز کو محسوس کرنا، اچھی چیز کو محسوس کرنا اور سطح سے بلند چیز کا احترام کرنا اب بھی داخل ہے، اگر یہ چیز بھی نکل گئی تو یہ آخری چیز ہوگی جو نکلے گی، تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم بتائیں کہ ہمارے مدارس میں کیا تعلیم و تربیت دی جاتی ہے، ہمارے مدارس میں کیسا ایثار سکھایا جاتا ہے۔

زہد وایثار کا ایک واقعہ

آج دنیا حیران رہ جائے گی، میں ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں کہ مولانا نجم الغنی صاحب نے تاریخ اودھ میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ مولوی عبدالرحیم صاحب رام پور میں رہتے تھے، اور وہ علوم عقلیہ کے ساتھ ریاضی کے بڑے ماہر تھے، تو جب بریلی میں پہلا انگریزی کالج قائم ہوا اور اس کے انگریز پرنسپل کو معلوم ہوا کہ رام پور میں ایک بڑے فاضل ریاضیات رہتے ہیں، تو اس نے پیغام بھیجا کہ آپ رام پور سے بریلی آجائیں، اور یہاں تدریس کی خدمت انجام دیں، انھوں نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ ریاست سے مجھے دس روپے ماہوار ملتے ہیں، وہ بند جائیں گے، ہاکنس نے کہا کہ میں تو ڈھائی سو روپے دے رہا ہوں، یہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی بات ہے، اس حساب سے دیکھیے کہ آج دو سو روپے کی کیا قیمت ہے، تو انھوں نے کہا کہ میری ایک بڑی مجبوری ہے کہ میرے دروازے پر بیری کا ایک درخت ہے، میں صبح اس سے ناشتہ کرتا ہوں، یہ میری صحت کے لیے ضروری ہو گیا ہے، اور وہ مجھے تازہ تازہ ملے گی نہیں، اس انگریز پرنسپل نے جواب دیا کہ میں ڈاک سے اس کے پہنچنے کا انتظام کر دوں گا، اور آپ کو وقت پر وہ چیز مل جائے گی، کہنے لگے پھر ایک تیسری دقت یہ ہے کہ جو ہمارے طلبہ ہیں، وہ کتاب میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں، کسی نے آدھی کتاب پڑھی، کسی نے تہائی پڑھی، اگر میں چلا آیا تو ان کی تعلیم ناقص رہ جائے گی، انھوں نے کہا: میں سب کی اسکالرشپ میں منظور کرتا ہوں، سب کو اسکالرشپ ملے گی، انھوں نے کہا کہ ایک بات رہ گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر خدا نے

قیامت کے دن مجھ سے پوچھا کہ تم رام پور چھوڑ کر بریلی کس لیے گئے تھے، کہ وہاں دس روپے ملتے تھے، اور وہاں ڈھائی سو روپے ملتے تھے، تو میں اس کا کیا جواب دوں گا؟ انگریز نے کہا (بہرحال وہ حقیقت پسند ہوتے ہیں) کہ اس کا جواب میرے پاس بھی نہیں ہے۔

آج اخلاقی تربیت اور کردار سازی ناپید ہوتی جارہی ہے

اور یہ میں نے ایک واقعہ سنایا ہے، صدہا واقعات سنائے جاسکتے ہیں، اس پر آپ یہاں خود دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فضلاء نے اور عربی اردو میں اور انگریزی میں بھی جو کتابیں لکھی ہیں، آپ ان کو دیکھیے، 'تاریخ دعوت وعزیمت' کا سلسلہ دیکھیے کہ ہمارے مصلحین نے اور ان تعلیم کے ذمہ داروں نے، سرپرستوں نے کیا نسل تیار کی، اس نسل کا کیا ذہن بنایا، آج وہ ذہن دنیا میں ناپید ہے، میں ایک سیاح انسان کی حیثیت سے اور کوئی دعوی نہیں کرتا، میں ایک سیاح اور جہاں گرد کی حیثیت سے کہتا ہوں، جس کی نگاہ سے شاید کوئی بڑا اہم ملک بچا ہو، ایک دو ملک بچ گئے ہیں، جاپان چین میں میرا جانا نہیں ہوا، لیکن یورپ وامریکہ اور اسپین تک گیا ہوں، اور اسپین کی میں نے سیاحت کی ہے، اور باقی یورپ کے ممالک تو بار بار کے میرے دیکھے ہوئے ہیں، تو میں آپ سے کہتا ہوں آج جس چیز کی کمی ہے، جس چیز کا کال ہے، جس کی وجہ سے یہ نظام حیات درہم برہم ہو رہا ہے، اور یہ نظام حیات بجائے تعمیری ہونے کے تخریبی بنا ہوا ہے، اور جس کی وجہ سے ممالک کی نہ سیاست قابو میں ہے اور نہ تعلیم قابو میں ہے، اور نہ عام زندگی قابو میں ہے، وہ وہ صفات ہیں جن کا علم، جن کی شناسائی بھی بڑی بڑی دانش گاہوں میں نہیں ہے، یونیورسٹیز میں نہیں ہے، میں ان کی بغیر کسی تحقیر کے کہتا ہوں کہ ان میں بہت سے مفید کام ہوتے ہیں، لیکن کردار سازی (Character Building) جس کا نام ہے، اور جس کا نام ہے اخلاقی تربیت، آج وہ ناپید ہوتی چلی جارہی ہے۔

سعید حلبی کا واقعہ

ابھی کل ہی ہماری مسجد میں سعید حلبی کا واقعہ پڑھا جارہا تھا، (اور یہ کس کان کے موتی ہیں، یہ کس معدن کے جواہرات ہیں، یہ سمجھ لیجیے، میں یہ اس لیے سنا رہا ہوں) تو سعید حلبی

ایک عالم تھے، دمشق میں درس دیا کرتے تھے، ابراہیم پاشا جو محمد علی باشا کا بیٹا ہے، جو فاتح مصر ہے، اور وہ اپنی سفا کی میں بہت مشہور تھا، دمشق میں اس کے جلاد کی دھوم مچی ہوئی تھی، اور اس کے قہر وغضب کا، اس کے مغلوب الغضب ہونے کا چرچا تھا، اس نے جب سنا کہ سید حلبی صاحب ہیں، یہی تنہا عالم ہیں جو ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آئے، اس نے حکم دیا تھا کہ ہر عالم اس سے ملنے آئے، اس سے سلام کرے، وہ نہیں آئے تو اس نے کہا: اچھا میں خود جاتا ہوں، وہ طیش سے بھرا ہوا تھا، وہ آیا اور اس کے ساتھ اس کا حفاظتی دستہ تھا، اتفاق سے اس دن ان کو نقرس کی، وجع المفاصل کی شکایت تھی، پاؤں سمیٹ نہیں سکتے تھے، تو قاعدہ یہ ہے کہ طلبہ جو بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں، ان کا رخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے، اور پڑھانے والا جو ہوتا ہے اس کا رخ دروازہ کی طرف ہوتا ہے، دروازہ سے جب وہ داخل ہوا تو طلبہ نے تو پورے طور پر نہیں دیکھا، لیکن انھوں نے دیکھ لیا، آ کر پاس کھڑا ہو گیا، جب طلبہ کی نظر پڑی اور ان لوگوں کی جو ساتھ آئے تھے، تو کہا کہ ہزار تکلیف ہو لیکن اس وقت وہ پاؤں سمیٹ لیں گے کہ حاکم شام کھڑا ہوا ہے، اور پھر وہ حاکم بھی کیسا ہے، وہ ایسا مغلوب الغضب آدمی کہ اسی وقت حکم دے دے گا کہ گردن اڑا دادی جائے، لیکن انھوں نے بالکل جنبش نہیں کی اور اسی طریقہ سے پڑھاتے رہے، من جانب اللہ ایسا ہوا کہ اس پر اثر پڑا اور جو اثر پڑتا ہے مخلصین کا، ربانیین کا، اور وہ وہاں سے خاموش چلا گیا، اور بہت ہی معتقد بھی ہوا، اس نے وہاں سے ایک اشرفیوں کا توڑا بھیجا، اور کہا کہ یہ قبول فرمایا جائے، جو بات انھوں نے کہی ہے وہ بات ایسی ہے سادہ سا فقرہ ہے، لیکن شاعروں کے دیوان اس پر قربان کر دینے کے قابل ہے، انھوں نے کہا کہ اپنے آقا کو سلام کہنا اور اس سے کہہ دینا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا، جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا۔

ایک عنقا

یہ وہ چیز ہے جو آج دنیا سے گم ہے، اور میں کہتا ہوں یہ چیز اگر پیدا ہو سکتی ہے تو انہی مدارس سے پیدا ہو سکتی ہے، اور خدا کے فضل سے میں اس کی مثالیں دے سکتا ہوں کہ کیسی

کیسی پیشکشیں آئیں، یونیورسٹیوں کی طرف سے پیشکشیں آئیں، میں نام نہیں لوں گا، اور یہاں کی یافت اور وہاں کی یافت میں کوئی تناسب نہیں تھا، صاف لکھ دیا گیا کہ ہم نہیں آسکتے، اور پھر ایسی بھی مثالیں ہیں کہ الحمد للہ گئے ایک بڑی یونیورسٹی میں یہیں کے ایک معلم کو۔ جو بہت تھوڑی تنخواہ پاتے تھے۔ اس کو وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلایا اور بڑا احترام اور اکرام کیا، اور اس کی کتابیں وہاں پڑھی جا چکی تھیں اور تعارف تھا، اس کا انھوں نے صرف ٹکٹ قبول کیا، اور وہاں تنخواہ کا ایک پیسہ قبول نہیں کیا، جو مشاہرہ دیا گیا تھا، صدر جمہوریہ کے دستخط سے ان کو پیش کش آئی تھی، انھوں نے کہا: میں لیکچر دوں گا، خطبات میرے تیار ہیں، میں سناؤں گا، لیکن جب تک وہ رہے، انھوں نے ایک مہینہ کی بھی تنخواہ نہیں لیا۔

ایسی کتنی مثالیں ہیں، یہ مثالیں اگر مل سکتی ہیں تو انہی مدارس میں مل سکتی ہیں، میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں اور فخر کرتا ہوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اپنی طرف سے بھی، بانیان مدارس کی طرف سے بھی جن میں صف اول میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اور شکر ہے کہ ان کے خاندان کے ایک قابل فرد یہاں تشریف رکھتے ہیں، پھر یہاں حضرت مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) سے تعلق رکھنے والے محترم حضرات بھی بیٹھے ہیں، اور ندوۃ العلماء کے بانیوں سے اور یہاں کے ناظموں سے تعلق رکھنے والا بھی آپ کے سامنے اس گفتگو کر رہا ہے، کہ یہ وہ عنقا ہے جس کو دنیا میں کوئی سیاح شکار نہیں کر سکتا، اس عنقا کو شکار کیا ہے تو ہمارے ان مدارس نے جو بعض اوقات کچی دیواروں کے اندر محدود تھے، اور جن کے یہاں درجے بھی نہیں بنے تھے، اور اب بھی اگر امید کی جا سکتی ہے تو انہی مدارس سے امید کی جا سکتی ہے۔

استقامت صرف انہی مدارس میں ملے گی

پھر ایک مسئلہ ہے استقامت کا، ایک مسئلہ ہے اخلاص کا، ایک مسئلہ ہے قربانی اور ایثار کا، زہد کا، اور ایک مسئلہ ہے استقامت کا، یہ استقامت بھی صرف ان مدرسوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے، میں تعلّی کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں، میں ایک مؤرخ کی حیثیت سے کہہ

رہا ہوں، ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ اگر استقامت دیکھنی ہو تو انہی مدارس میں آپ کو ملے گی، کہ جو طریقۂ عمل شروع سے رہا، جس طرح زندگی گزارتے تھے، اسی طرح اخیر تک زندگی گزارتے رہے، وہاں اگر تنخواہوں میں اضافہ بھی ہوا، اور اگر دوسرے مواقع نفع کے اور ترقی کے حاصل بھی ہوئے، جب بھی ان کے کردار میں اور ان کے طریقۂ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، وہی ان کی خوراک، وہی ان کی پوشاک، وہی ان کا رہنا سہنا اور وہی ان کا معیار زندگی، اور اقدار حیات، اقدار و قیم (Values & Ideals) جسے کہتے ہیں، یہ صرف مدارس عربیہ دینیہ میں بنتے ہیں، میں دعوے کے ساتھ کہہ رہا ہوں، مسجد میرے سامنے ہے، اور اتنے شاہد موجود ہیں، میں کہتا ہوں کہ اخلاص، استقامت، خشیت الٰہی اور علم کا احترام اور علم میں اپنی زندگی کو فنا کر دینا، گھلا دینا، اور اسی میں جان دے دینا، جس کے صدہا واقعات سنائے جا سکتے ہیں، کہ پڑھاتے پڑھاتے جان دی ہے لوگوں نے، یہ سب ان مدارس میں ہی مل سکتی ہے۔

اگر ان لوگوں میں ذرا بھی حب الوطنی ہو (میں اور کچھ نہیں کہتا)، ذرا سی بھی حب الوطنی ہو یا انسانیت کی قدر ہو، اور ہمدردی ہو، تو ادب اور تعظیم کے ساتھ جس طرح سے یہ لوگ پاٹھ شالاؤں میں جاتے ہیں، (میں مسلمانوں کے لیے نہیں کہتا، ان کے لیے کسی جگہ پر وہ تعظیم ضروری نہیں)، لیکن وہ لوگ جو پاٹھ شالاؤں میں جاتے ہیں، مندروں میں جاتے ہیں، یہاں سر جھکا کر کے آئیں، ہاتھ جوڑے ہوئے آئیں، اور کہیں کہ آپ لوگوں سے انسانیت کا بھرم باقی ہے، اور انسانیت کی عزت اور آبرو باقی ہے، تو ایسی حالت میں اس طرح کی کارروائی جو کی گئی، میں اس کا ذمہ دار سب کو نہیں گردانتا، میں اس میں کچھ انتظامی بے خبری، اور انتظامی بے شعوری کو بھی اس کا ایک سبب مان سکتا ہوں، اس کا ایک ذمہ دار مان سکتا ہوں۔

لیکن بہرحال یہ ہمارے ملک کے لیے ٹیکا ہے، ایک داغ ہے اس کے چہرے پر، ایک ٹیکا ہے، ہمارے پاس جو خطوط آئے ہیں، جو تار آئے ہیں، جو فیکس آئے ہیں، بیرونی ممالک سے، ممالک عربیہ سے، وہ اگر ان لوگوں کی نظر سے گزریں تو ان کو معلوم ہو کہ لاکھوں روپے جو انھوں نے اپنی ایمبیسیز (Embassies) میں خرچ کیے ہیں، اور ایمبیسیز کے ذریعے

سے خرچ کیے ہیں، میں نے دمشق کی بھی ایمبیسی دیکھی، قاہرہ کی ایمبیسی بھی دیکھی، اور دوسرے ملکوں میں بھی دیکھی ہے، وہاں سوئزرلینڈ میں بھی دیکھی، اور انگلینڈ وغیرہ میں تو خیر آنا جانا ہوتا ہے، تو یہ لاکھوں روپے جو پروپیگنڈے پر خرچ کیے جاتے ہیں، رشوتیں دی جاتی ہیں، اور جو ان پر خرچ آتا ہے، وہ سب ایک طرف، اور یہ جو بدنامی ہوئی ہے، جس سے کلنک کا ٹیکا جو لگا ہے، اس نے سب پر پانی پھیر دیا۔

ممالک عربیہ میں ہندوستان کی قدر یہاں کے مدارس کی وجہ سے ہے

آج آپ کے سامنے ایک شاہد عینی کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کی قدر کم سے کم ممالک عربیہ اور اسلامیہ میں جو ہے، وہ دیوبند و مظاہر علوم اور دار العلوم ندوۃ العلماء اور اس سے جو ملحق مدارس ہیں، ان کی وجہ سے ہے، آپ اسی رسالہ میں دیکھیں گے کہ ایک بہت بڑے، بلکہ میری نگاہ میں سب سے بڑے ادیب اور اس وقت کے صاحب طرز ادیب علی طنطاوی صاحب نے، جو دمشق کی اپیلنگ کورٹ کے جج رہے ہیں، اور بغداد یونیورسٹی میں عربی ادب کے پروفیسر رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ مجھ سے ٹیلی ویژن پر پوچھا گیا کہ آپ کہاں رہنا پسند کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ اگر میں اپنے وطن دمشق جا سکوں تو میں دمشق جانا پسند کروں گا، اور وہاں نہ جاؤں تو کم سے کم حرم کے سائے میں مجھے مکہ میں رہنا نصیب ہو، یہیں رہوں، لیکن اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر میں لکھنؤ کو ترجیح دوں گا۔ تو پوچھا گیا: آپ لکھنؤ کو کیوں ترجیح دیں گے؟ کہنے لگے: ندوۃ العلماء کی وجہ سے، میں وہاں کی پُر فضا اور پُر بہار مقام میں بھی رہوں گا، اور وہاں اساتذہ سے بھی تبادلۂ خیال کروں گا، میں استفادہ نہیں کہتا، ان سے مذاکرہ کروں گا، ان کی صحبتوں میں بیٹھوں گا، اور ایسی کئی چیزیں ہیں، بعض چیزیں میں نے اس میں نقل بھی کی ہیں۔

تو ان لوگوں کو یہ خبر نہیں، ان کی معلومات صرف ہندی اور انگریزی اخبارات تک محدود ہیں، اور جب یہ باہر جاتے ہیں تو آنکھوں پر ایک پٹی باندھ کر کے جاتے ہیں، سیاست کی پٹی باندھ کر جاتے ہیں، صرف سیاسی لوگوں سے ملتے ہیں، عام مجلسوں میں جہاں پر لوگ بے

تکلف باتیں کرتے ہیں اور تفریحی موقعے ہوتے ہیں یا اظہار خیال کے آزادانہ مواقع ہوتے ہیں، ان میں ان کو جانے کا موقع ہی نہیں ملتا، ان کے وہاں کے مشاہدات اور معلومات بھی محدود ہیں، اگر ان کو معلوم ہوتا تو یہ ہزاروں لاکھوں روپے صرف کرنے کے بجائے صرف اسی ایک بات کو قائم رکھتے اور اس بات کی تصدیق کرواتے اور اس بات کو ثابت کرتے کہ ہمارے یہاں مدارس دینیہ عربیہ از ہر کے ٹکر کے موجود ہیں، اور آپ کی جامعات کے ٹکر کے موجود ہیں، اور یہاں کے مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں آپ کی یونیورسٹیوں میں اور آپ کے کالجوں میں نصاب میں داخل ہیں۔

ایک نعمت

یہ میں آپ سے کہتا ہوں، ندوہ کے لیے فخر ہے کہ اس کی جو ابتدائی کتابیں ہیں، وہ اسکولوں میں داخل ہیں، اور ابھی مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں آپ کے سامنے تحدیث بالنعمۃ کے طور پر بھی اللہ کے سامنے عرض کرتا ہوں کہ اس وقت اگر میں کوئی صوفی ہوتا تو مجھ پر وجد طاری ہو جاتا، کہ میں مدینہ طیبہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں کے ایک رئیس شیخ صالح الحصیّن جو بڑے علم کے قدرداں ہیں، پہلے ایک دن آئے تو انھوں نے کہا کہ آپ کی کتاب قصص النبیین للأطفال کا ترجمہ فرنچ وغیرہ میں ہو رہا ہے، دوسرے دن جب آئے تو انھوں نے کہا: دیکھیے! یہ اسپین کے ہیں، انھوں نے اسلام قبول کیا ہے، اور اب اسپین کی زبان میں قصص النبیین للأطفال کا ترجمہ کر رہے ہیں، کتنی خوشی کی بات اس پر ہے، آدمی سجدہ میں گر جائے اور حال طاری ہو جائے کہ ہندوستان کا ایک گناہ گار، عاجز، بے سلیقہ، بے شعور، غیر ذہین، وہ یہاں بیٹھ کر کتاب لکھتا ہے، اور وہ اسپین میں جہاں سے اسلام نکالا گیا ہے، اور شہر بدر کیا گیا ہے، اور جہاں کان ترستے ہیں اذانوں کو سننے کے لیے، آنکھیں ترستی ہیں نماز پڑھنے والوں کو دیکھنے کے لیے، اور جہاں قرطبہ کی ایسی مسجد ہے، اس میں بالکل چھ چھ گرجا قائم ہیں، اور وہاں علامہ اقبال نے نماز پڑھی تھی، اور اللہ نے مجھے بھی توفیق دی کہ میں نے علی الرغم وہاں نماز پڑھ لی، اس ملک میں پہلی کتاب جس کا ترجمہ ہو رہا ہے، وہ انبیاء علیہم

السلام کے قصے ہیں، اور وہ ایک ہندی کے لکھے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ اسی کو ذریعۂ مغفرت بنادے کہ اسپین میں ہم اذان نہیں پہنچا سکے، تو یہ کیا کم ہے کہ جنھوں نے اذان سکھائی، جنھوں نے اذان دلوائی، ان کے حالات وہاں پڑھے جائیں، سیدنا ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ پڑھا جائے، اسپین کے صلیب پرست اور تثلیث پرست ملک میں، اور پھر اس کے بعد سید المرسلین خاتم النبیین محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت وہاں اسپینی زبان میں پڑھی جائے، یہ بات مسلمانوں کے لیے کتنی قابل شکر اور غیر مسلموں کے لیے کتنی قابل فخر ہے کہ یہاں بیٹھ کر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ وہاں کے نصاب میں داخل ہوتی ہیں، اور عرب ان کو بڑے اعتراف کے ساتھ اور بہت دل چسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس کے علاوہ اور بہت سی شہادتیں ہیں، لیکن یہ سب موقوف تھا سچی حب الوطنی پر، ملک دوستی پر، اور حقیقت بینی پر، اور حقیقت شناسی پر۔

ہندوستان کی آزادی سو فیصدی علماء کرام کی رہین منت ہے

اور پھر جہاں تک جنگ آزادی کا تعلق ہے، میں اس وقت اس باوقار مجمع کے سامنے کہتا ہوں: ہندوستان کی آزادی تنہا سو فیصدی ممنون ہے، رہین منت ہے علماء کی، یہ احسان ہے علمائے کرام کا، اور مدارس سے نکلنے والوں کا، آپ کو معلوم ہے سر ولیم ہنٹر نے (Our Indian Musalmans) میں صاف صاف لکھا ہے کہ غدر میں اصل چنگاریاں حضرت سید احمد شہیدؒ کی جہاد کی تحریک کی چنگاریاں تھیں، اگر ہندو اپنے حال پر چھوڑ دیے جاتے تو وہ کبھی یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے، یہ مسلمان تھے جو قیادت کر رہے تھے، اور پھر وہ پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے مہاراجہ گوالیار کو خط لکھا اور اس میں یہ لکھا کہ 'ایں بیگانگانِ بعید الوطن ملوکِ زمین و زمن گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ'، 'یہ خوانچے بیچنے والے اور یہ چھوٹی چھوٹی دکانیں رکھنے والے انگریز اور یہ پردیسی باہر کے آئے ہوئے ہمارے ملک کے مالک بن گئے' سوچیے کہ اس کا خیال کیسے آ سکتا تھا؟ حضرت مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) نے 'نقش حیات' میں پہلے اس خط کو ہماری کتاب کے حوالے سے نقل بھی کیا کہ کیا

دور بینی تھی ! کیا حقیقت شناسی تھی ! کیا جرأت تھی ! کیا جرأت فکر تھی ! اور کیا اولو العزمی تھی، کہ ایک شخص جس کی ساری تربیت شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کے ماحول میں ہوئی ہے، اور جو توحید اور سنت کا اصل داعی اور منادی ہے، اس کی نگاہ نے اس بات کو پالیا کہ اس وقت ہندو مسلمان مل کر جب تک انگریزوں کو نہ نکالیں گے، اس وقت تک یہ ملک آزاد نہیں ہوگا، تو انھوں نے یہ خط لکھا، ان کے افسر افواج کے نام بھی خط لکھا، اور اسی لالچ میں، اسی امید میں نواب امیر خاں (والی ریاست ٹونک) کے ساتھ برابر جنگ میں شریک رہے، جب ان کی انگریزوں کے ساتھ صلح ہوگئی اور انھوں نے ٹونک کی ریاست قبول کر لی، اسی وقت چھوڑ کر شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس آ گئے۔

پھر اس کے بعد آپ کو اعداد و شمار ملیں گے کہ مسلمانوں نے کمّاً و کیفاً کیسا حصہ لیا ہے، اور آپ کو معلوم ہے کہ انڈومان میں، کالے پانی جو لوگ بھیجے گئے، یہ سب مدارس کے لوگ تھے، مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا احمد اللہ صاحب، مولوی عبدالرحیم صاحب صادقپوری، مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی، اور مفتی مظہر کریم صاحب دریابادی اور مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی خالص مدارس کے لوگ تھے، کوئی معقولات پڑھاتا تھا، کوئی حدیث پڑھاتا تھا، یہی لوگ گئے ہیں، ہمیں ایک غیر مسلم کا نام نہیں ملتا جسے کالا پانی بھیجا گیا ہو۔

اگر یہ مدارس نہ ہوں تو....؟

اگر یہ مدارس نہ ہوں تو بالکل ایک اندھیرا سا ہو جائے گا، اور یہاں کوئی قربانی کے لیے، ایثار کے لیے، حب الوطنی کے لیے، انسان دوستی کے لیے، احترام انسانیت کے لیے، اور جان و مال اور آبرو کی قیمت اور اس کی حفاظت کی ضرورت کے لیے کوئی منہ نہیں ہوگا جو بول سکے، اور کوئی قلم نہیں ہوگا جو لکھ سکے، اور کوئی گوشہ نہیں ہوگا جہاں سے یہ آواز آسکے، یہ سب فیض ہے مدارس کا، ان کا رہنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس ملک میں یہ کردار رہے گا، اور کم سے کم ایک نمونہ ایک ماڈل انسانیت کا ایسا آئے گا اس ملک کے لوگوں کے سامنے بھی، اور باہر کے لوگوں کے سامنے بھی۔

ہندوستان کی عمارتوں پر، تاج محل پر، اور قلعوں پر، اور گنگا جمنا پر اور ہمالیہ کی چوٹی پر فخر کرنا، اس کی کوئی بہت بڑی قدر و قیمت نہیں ہے، اصل فخر جو ہوتا ہے وہ اُس ملک کے پیدا کیے ہوئے، اس ملک میں موجود پانے والے ان بلند انسانوں کی وجہ سے ہوتا ہے جنھوں نے ملک کا نام اونچا کیا، اور ملک کو انھوں قہر الٰہی سے بچایا، ملک کو ایک دائمی زوال سے بچایا، یہ وہ لوگ ہیں جو تاریخ میں نظر آتے ہیں، سب اسی صف لوگ نظر آتے ہیں، دیکھ لیجیے شروع سے لے کر آخر تک کہ کنھوں نے تاتاریوں کو مسلمان کیا، کنھوں نے تاتاریوں کے حملے سے صرف مسلمانوں کو نہیں دنیا کو بچایا، (Historian's History of the World) کا مؤرخ لکھتا ہے کہ تاتاریوں کا جب حملہ ہوا تو اس کی دہشت یورپ تک پھیل گئی اور انگلستان کے ساحل پر مچھلی کا شکار کھیلنے کے لیے لوگ کئی ہفتے تک نہیں آئے کہ تاتاری کہیں یہاں نہ آ جائیں، اور یہ ایک عربی ضرب المثل تھی کہ سب کچھ ماننا ایک بات نہ ماننا، 'إذا قِيلَ لَكَ إنّ التَّتَرَ قد انهزموا فلا تُصَدِّقْ' اگر کوئی تم سے کہے کہ تاتاریوں نے شکست کھائی، تو کبھی اس پر یقین نہ کرنا، لیکن تاتاری جو بالکل اس وقت پوری آباد اور متمدن دنیا کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے، اور بقول انگریز مؤرخین کے اگر ایسا ہو جاتا تو دنیا کو اپنا نیا سفر شروع کرنا پڑتا، اگر تاتاری اسی طرح برسر اقتدار رہتے اور وہ مسلح رہتے، اور حملہ کرتے۔

ہندوستان میں تاریخ مسلمانوں کی لائی ہوئی ہے

لیکن یہ کس کا فیض ہے کہ وہ تاتاری مسلمان بنے اور علم کے قدرداں بنے، اور پھر کیسی سلطنتیں قائم کیں، اور آج آپ ہندوستان میں جو یہ دیکھ رہے ہیں، مغلوں کی دی ہوئی کتنی چیزیں ہیں، مغلوں نے یہاں کھانا کھانا سکھایا، مغلوں نے یہاں کپڑا پہننا سکھایا، مغلوں نے یہاں مکان بنانے سکھائے، مغلوں نے یہاں جانوروں کو ترقی کی، مغلوں نے جنگلی آم کو قلمی آم میں تبدیل کیا، اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تاراچند بھی اپنی کتاب میں اعتراف کر چکے ہیں، اور جواہر لال صاحب لکھ چکے ہیں کہ کسی ملک میں باہر کی ہوا کا جھونکا نہ آنا اس ملک کے لیے بڑے ادبار کی بات ہے، کہ گویا یہ اچھا ہوا کہ باہر سے جھونکے آئے، ورنہ ایک

طرف سمندر راستہ روک رہا تھا، اور ایک طرف ہمالیہ پہاڑ کھڑا تھا، مگر یہ مسلمان جو یہاں آئے وہ اپنے ساتھ تاریخ لائے، انگریز مؤرخین نے اعتراف کیا ہے، تاریخ مسلمانوں کی لائی ہوئی ہے، ہسٹری یہاں تھی ہی نہیں، مسلمان یہاں تاریخ لائے ہیں، اس وقت یہاں تاریخ کی تدوین شروع ہوئی۔

مدارس کی افادیت اور ان کی خصوصیات و کارنامے بیان کرنے کی ضرورت

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اپنے مدارس کی اصل افادیت بلکہ اس کی ضرورت اور اس کا لزوم ثابت کرنا چاہیے، اس کے لیے ہندی اور انگریزی میں لٹریچر تیار ہونا چاہیے، اور اس کے لیے ایسے سیمینار منعقد ہونے چاہئیں جن میں کہ ان مدارس کی خصوصیات بیان کی جائیں، ان کے کارنامے بیان کیے جائیں، اور بتایا جائے کہ جنگ آزادی میں ان کا کیا حصہ رہا ہے، اور یہ ملک کس کس شعبۂ زندگی میں ان کا ممنون اور رہین منت ہے، وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین۔[1]

---

(۱) نومبر ۱۹۹۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء پر پولیس چھاپہ اور فائرنگ کے واقعہ کے بعد ۰۵/ جنوری ۱۹۹۵ء کو ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں منعقد 'تحفظ مدارس کنونشن' کے افتتاحی اجلاس میں کی گئی تقریر، یہ تقریر قلمبند کرنے کے [illegible] ہے

مدارس امت مسلمہ کے لیے سرچشمۂ حیات ہیں

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و خاتم النبيين محمد و آله و صحبه أجمعين، و من تبعهم بإحسان و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد! اعوذ بسم ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ﴾ [العلق: ١-٥]

سوچنے کی بات

حضرات! ایک ایسے دار العلوم میں، ایک ایسے علمی مرکز میں جس کی شہرت پورے عالم اسلام میں ہے، اور جہاں علم کے آخری درجہ کی کتابیں اور علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں، اور اس کے نکات اور حقائق بیان کیے جاتے ہیں، اس کے ایک ایسے جلسہ کا اختتام جو مدارس ہی کی حفاظت اور مدارس کی ترقی اور مدارس کے بقا کے لیے کیا گیا ہے، میں اُن آیتوں سے کرتا ہوں جن سے مسلمان کی بسم اللہ ہوتی ہے، اور اس سے زیادہ موزوں کوئی اور بڑے سے بڑا عارف اور بڑے سے بڑا ذہین آدمی بھی نہیں کرسکتا۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک اُمی قوم میں-- جس کو قرآن مجید میں خود کہا گیا ہے یہود کی زبان سے ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّيْنَ سَبِيْلٌ﴾ [سورة آل عمران: ٧٥] ہم عرب کے باشندوں کے ساتھ کوئی معاملہ کریں، کوئی زیادتی کریں، ان کے مال پر قبضہ کرلیں، غصب کرلیں، ان کو ایذا پہنچائیں، ہم سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہ جانوروں کے حکم میں ہیں، جانور کو اگر کوئی استعمال کرے، مار دے، تکلیف پہنچائے، تو کوئی محاسبہ نہیں ہوگا-- اور ایک ایسی قوم جس کو اُمیین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں اس کا ذکر

کر کے اس کو قیامت تک کے لیے باقی رکھا گیا ہے، ایک ایسے شہر میں کہ جہاں قلم ڈھونڈھنے سے ملتا، میں اپنے تاریخ عرب کے مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ مکۂ مکرمہ میں شاید تین چار گھروں میں قلم مل سکتا، زیادہ قلم دستیاب نہیں ہوسکتا تھا، اور پھر ایک ایسی شخصیت پر، ایک ایسے انسان کامل پر، اور ایک ایسے اللہ کے محبوب بندے پر کہ جو دنیائے انسانیت کو نجات دینے کے لیے مبعوث ہوا ہے، اور جس کو علم کے دریا پھیلانے ہیں، دریا بہانے ہیں، اور علم کے خزانے زمین سے اگلوانے ہیں، اور جس کو ذہانت اور قوت مطالعہ اور تدقیق و تحقیق کی آخری معراج تک پہنچانا ہے، وہ خود اُمی ہے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوتی ہیں۔

اس امت کا دامن علم سے باندھ دیا گیا ہے

تو اس امت کا دامن علم سے باندھ دیا گیا ہے، اور اس امت کے لیے گویا یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردی گئی ہے ان آیتوں کے ذریعے، کہ پہلی وحی جو نازل ہوتی ہے اس میں نہ عقائد کے بارے میں کچھ کہا جاتا ہے، نہ ان چیزوں کے بارے میں جو بنیادی چیزیں ہیں، جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے، نہ عبادات کے متعلق کہا جاتا ہے، نہ معاملات کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے، اور نہ وہاں کے رسوم کے خلاف کچھ کہا جاتا ہے، نہ جاہلیت کے خلاف کہا جاتا ہے، وہاں جو پہلی بات کہی جاتی ہے، پہلا لفظ جو بولا جاتا ہے، حضرت جبرئیل جس کو ادا کرتے ہیں، آپ سے ادا کروانا چاہتے ہیں، وہ ہے: ﴿اِقْرَأْ﴾۔

یہ ایک انکشاف، یہ ایک حیرت انگیز چیز ہے کہ سوچنے سمجھنے والے انسان کو بڑے تفکر اور تدبر پر، اور ذہانت پر اور نکتہ شناسی پر، حاضر شناسی پر آمادہ کرتی ہے، مگر چونکہ جو چیز زیادہ پڑھی جاتی ہے، نظر سے گزرتی ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی یا نوبت نہیں آتی، اور سب سے پہلے یہی آیتیں پڑھی جاتی ہیں، اسی سے بسم اللہ ہوتی ہے، اسی لیے اس پر بھی —اور یہ فطرت انسانی ہے— غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی یا نوبت نہیں آتی۔

تو ایک تو یہ کہ اس امت کے لیے قرأت سے اس کا دامن باندھ دیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک شرط یہ ہے کہ علم اور اسم دونوں کو جمع کیا گیا ہے، دنیا کی یہ بڑی قسمت ہے اور

بڑی بدنصیبی ہے، اس کو امریکہ اور یورپ میں اور ترقی یافتہ دور میں دیکھا جا چکا ہے کہ علم کا رشتہ جب اسم سے ٹوٹ گیا ہے، تو وہ علم علم نہیں، بلکہ جہل، جہل نہیں بلکہ جہل آموز چیز اور انسانیت سوز چیز اور حقائق کو بھلا دینے والی اور آخری درجہ میں خدا فراموش بنا دینے والی چیز بن گیا ہے، یہ ایک سانحہ ہے دنیا کا۔

آج علم نافع کیوں نہیں؟

اس کو میں نے مغربی ممالک میں بھی کہا کہ علم جو آج مفید نہیں ہو رہا ہے، نافع نہیں ہے، وہ اس وجہ سے کہ علم علم ہے لیکن اسم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے علم کو اسم کے ساتھ جوڑا تھا، اور دونوں کا دامن باندھ دیا تھا، اور علم کو اسم کے ساتھ مربوط کر دیا تھا، جب علم اسم سے محروم ہو جائے گا، اور پھر محروم ہی نہیں باغی ہو جائے گا، اس اسم کے خلاف وہ بغاوت کرے گا، انکار ہی نہیں بلکہ اس کو پردۂ وجود سے ختم کرنا چاہے گا، وہ علم علم وحشت آمیز نہیں، وحشت انگیز نہیں، بلکہ وحشت آموز بن جائے گا، اور ظلم کا دریا بہانے والا اور ظلم کی آگ لگا دینے والا بن جائے گا، اور جو کچھ فساد ہم کو آج یورپ و امریکہ میں نظر آ رہا ہے، وہ سب اس وجہ سے کہ علم کا رشتہ اسم سے ٹوٹ چکا ہے، اور اب علم وہ علم نہیں ہے جو انسانیت پیدا کرے، بلکہ وہ علم ہے کہ جو درندگی پیدا کرے، وحشت پیدا کرے، سَبُعیت پیدا کرے، سفاکی پیدا کرے، نفس پرستی پیدا کرے۔

مدارس امت مسلمہ کے لیے کیوں ضروری ہیں؟

تو جہاں تک مسلمانوں کا، امت مسلمہ کا تعلق ہے، اس کا تو دامن بندھا ہوا ہے، اس کے لیے تو شرط ہے کہ اس کی زندگی کا آغاز، اس کی شعوری زندگی کا آغاز کم سے کم ﴿اِقْرَأْ﴾ قرأت' کے عمل کے ساتھ ہو، اور اسم کے سایہ کے نیچے ہو، اسم ربانی، اسم الٰہی کے سایہ کے نیچے ہو، اور وہ اس کی سرپرستی میں ہو، اس کی رہنمائی میں ہو، اس کی رفاقت میں ہو، تو جہاں تک امت مسلمہ کا تعلق ہے، اس کے لیے تو مدارس اس لیے ضروری ہیں کہ یہ مدارس اس کی زندگی کا سرچشمہ ہیں، اور اس کو اسلام کے راستے پر ڈالنے والے ہیں، اسلام کو سمجھانے

والے ہیں، اسلام پر عمل کرنے کی ترغیب دینے والے اور پھر زمانے میں جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں، ان تغیرات سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، بلکہ مصائب پیدا ہوتے ہیں، تناقضات پیدا ہوتے ہیں، امتحانات پیدا ہوتے ہیں، اُن کا علاج بھی بتانے والے ہیں۔

ایک اعلان

جہاں تک امت مسلمہ کا تعلق ہے، علم تو اس کے لیے سانس کی طرح ہے، روح کی طرح ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ علم اسم الٰہی سے مربوط ہو، اور اسی کی رہنمائی میں ہو، اور پھر انھیں آیتوں میں خیال فرمائیے کہ غار حراء میں یہ آیتیں نازل ہو رہی ہیں ایک نبی اُمی پر، اور ایک شہر اُمی پر، بلد اُمی میں، اور ایک ملک اُمی میں اور ایک اُمت اُمیہ میں، لیکن اس میں قلم کا بھی ذکر ہے، اس میں صاف پیشین گوئی تھی، اس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا کہ ان آیتوں میں یہ اعلان کیا ہے اور اس اعلان پر بہت کم لوگوں نے غور کیا کہ یہ امت قلم کے استعمال کرنے والی امت ہوگی، اور قلم سے ہدایت و رہنمائی کا کام لے گی، قلم سے وہ ان خرابیوں، ان بیماریوں کو دور کرے گی جن میں انسانیت مبتلا ہے، قلم کا سب سے زیادہ صحیح استعمال کرنے والی یہ امت ہوگی، اس لیے کہ اس کے نبی اُمی پر جو آیتیں نازل ہو رہی ہیں، ان میں بھی قلم کو فراموش نہیں کیا گیا ہے، اس میں قلم کا لفظ آیا ہے: ﴿الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ﴾۔

مدارس امت مسلمہ کے لیے حیات کی ایک شرط ہیں

تو جہاں تک امت مسلمہ کا تعلق ہے، یہ آج اس جلسے کے موضوع کا بھی تقاضا ہے کہ یہ بات صاف صاف کہہ دی جائے، اور جو تجاویز پڑھی گئیں کہ مدارس امت مسلمہ کے لیے حیات کی ایک شرط ہیں، وہ اس کی شرائط حیات اور شرائط بقاء میں سے ہیں، اور اُسی سے اِس امت کا بقا اور تسلسل بحیثیت امتِ ہدایت کے باقی رہے گا، جس کا علم سے کبھی رشتہ توڑا نہیں جا سکتا، اور توڑا جائے تو ٹوٹ نہیں سکتا، اور اگر توڑا جائے گا تو پھر یہ امت کشی ہوگی، امتِ اسلام کشی ہوگی، پھر اس کے بعد جہاں تک تعلق ہے دوسرے ممالک کا، اور دوسرے تمدنوں کا، اور تمدنی مرکزوں کا، تو میں نے جیسے اشارہ کیا اپنی پچھلی معروضات میں کہ یہ

مدرسے شفا خانے ہیں ان ملکوں کے لیے، اور بلکہ میں صاف کہتا ہوں، بات ذرا سمجھ میں آنے والی ہے کہ مدارس کا وجود میڈیکل کالجز سے زیادہ ضروری ہے، یہ میڈیکل کالج جہاں پر علاج ہوتا ہے، جہاں بالکل لب دم اور جاں بلب مریضوں کو لے جایا جاتا ہے، میں ان کی افادیت سے انکار نہیں کرتا، اور میں اس سے بعض ذرائع سے اور بعض مواقع سے بہت قریب بھی رہا ہوں، تیمار دار کی حیثیت سے بھی میں نے قیام کیا ہے، مریض کی حیثیت سے بھی میں نے قیام کیا ہے، اور میرے مربی اور معلم میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب لکھنؤ کے میڈیکل کالج کے فاضل تھے اور اس کے سند یافتہ تھے، تو میں ان کی افادیت سے انکار نہیں کرتا۔

لیکن اگر غیر فانی حیات اور آخرت، اور انسان کی ہدایت وضلالت کا مسئلہ، اور انسان کی حیات و ہلاکت کا مسئلہ سامنے لایا جائے، اور حیات بھی نافع، حیات بھی حیات بخش، حیات ہی نہیں، حیات بخش، اور پھر علم بھی نافع، اور پھر دوسروں کو نفع بھی پہنچانے والا ہو، تو یہ مدارس ان میڈیکل کالجز سے بھی زیادہ ضروری ہیں، وہاں جسم کا علاج ہوتا ہے، عضو کا علاج ہوتا ہے، کسی انسانی جسم کے کسی ٹکڑے کا علاج ہوتا ہے، کسی بیماری کا انکشاف ہوتا ہے، لیکن وہ بہر حال زندگی عارضی ہے، زندگی کی بیماریاں بھی عارضی ہیں، زندگی کا انجام بھی سب کو معلوم ہے، یہ زندگی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔

مدارس سے حیات ابدی کا تحفہ ملتا ہے

لیکن یہ مدارس وہ شفا خانے ہیں جہاں سے حیات ابدی کا تحفہ ملتا ہے، اور حیات اخروی کی نعمت ملتی ہے، اور انسان کا خدا سے ربط قائم ہوتا ہے، مخلوق کا ربط خالق سے قائم ہوتا ہے، مرزوق کا ربط رازق سے قائم ہوتا ہے، مجبور کا ربط قادر مطلق سے قائم ہوتا ہے، اور یوں سمجھئے کہ انسان اس کے ذریعے سے بامعانی بنتا ہے، اور ایک زندگی کی ضرورت ثابت ہوتا ہے۔

اس لیے اگر انصاف ہو، سلامت فکر ہو، اور حکومت تعصبات سے پاک ہو، اور وہ حقائق کو سمجھنے والی ہو، تو اس کو خود ان مدارس کو قائم کرنے کے لیے انتظامات کرنے چاہئیں، اور بلکہ

اس کے لیے ضد کرنی چاہیے، اور اس کے لیے اس کو احکام کرنے جاری کرنے چاہئیں، اگر ہمارے ملک میں یا کسی ملک میں یا یورپ وامریکہ کے کسی ملک میں بھی یہ حقیقت پسندی پیدا ہو جائے، اور انسان کے آغاز وانجام پر اس کی نظر ہو، اور آسمانی کتابوں پر اور آسمانی تعلیمات سے وہ واقف ہو، اور کم سے کم یہ سمجھے کہ یہ حیات فانی ہے، اور چاہے کتنے ہی سال کی ہو، سو برس کی ہو، یا اس سے زائد کی ہو، اس کے بعد پھر فنا ہونا ہے، آگ میں جل جانا ہے، یا مٹی میں چھپ جانا ہے، اگر اس حقیقت پر بھی نظر ہو تب بھی وہ ان مدارس کی - جہاں سے حیات حقیقی کا پیغام ملتا ہے، اور شفائے کلی کا پیغام ملتا ہے، اور جہاں سے زہر کا تریاق ملتا ہے، اور جہاں سے زندگی میں معنویت پیدا ہوتی ہے، زندگی میں افادیت پیدا ہوتی ہے، اور زندگی میں ارتقاء پیدا ہوتا ہے، اور زندگی میں انصاف پیدا ہوتا ہے، اور زندگی میں انسان دوستی پیدا ہوتی ہے - وہ ان مدارس کی سرپرستی کرے اور ان کو قائم کرے اور قائم کروائے، اور اگر کوئی ان کو بُری نگاہ سے دیکھے تو وہ اس کی دشمن بن جائے کہ ان مدارس کا رہنا ضروری ہے۔

اگر ہمارے ہندو بھائیوں میں، ہمارے ان ہم سایہ گان میں اور ہمارے ہم وطنوں میں اگر حقیقت پسندی ہوتی تو ان مدارس کی - جہاں خدا سے ڈرنا سکھایا جاتا ہے، خدا کی معرفت بتائی جاتی ہے، انسان کا درجہ بتایا جاتا ہے کہ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ اور جہاں ناانصافی کو اور ایذا رسانی کو اور نفس پرستی کو بُرا بتایا جاتا ہے، اور اس کی مذمت کی جاتی ہے، اور اخلاق سیئہ سے روکا جاتا ہے - وہ ان کی ایسی قدر کرتے کہ وہ شفاخانوں سے اور میڈیکل کالجوں سے زیادہ ہوتی، مگر افسوس ہے کہ جو فطری حقائق ہیں، اور ابدی حقائق ہیں، عمومی حقائق ہیں، آفاقی حقائق ہیں، ان پر پردے پڑ گئے ہیں، زمان ومکان کی تنگیوں کے اور زمان ومکان کے اثرات کے، اور باہر کے خداناشناس ملکوں کی تہذیب کے اثرات پڑ گئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ملک خود بھی زوال کی طرف جارہے ہیں۔

اور میں صفائی کے ساتھ کہتا ہوں جو وہاں لوگ جا چکے ہیں، جو لوگ وہاں کے حالات پڑھتے ہیں کہ یہ جو کوشش ہو رہی ہے اس وقت Fundamentalism کے خلاف، اور مسلمانوں میں مذہبی جذبہ کو سرد کرنے کے لیے، اس میں اس کو بھی دخل ہے، احساس کمتری کو

بھی دخل ہے، اوراس میں اس خطرے کے احساس کو بھی دخل ہے کہ امریکہ اور یورپ اور مغرب زوال کی طرف جارہے ہیں، اوراس میں ایک امکان یہ بھی ہے کہ اسلام قبول کرلیں، انھوں نے اپنی تشفی کے لیے بھی اور کسی قدراس کے انتظامی لحاظ سے بھی ان اسلامی ممالک میں خود یہ تحریک پیدا کی ہے کہ بنیاد پرستی کو ختم کیا جائے، اورافسوس ہے کہ ہمارے ان ملکوں کے حکمرانوں نے اور وہاں کی صاحب اقتدار جماعت نے اس کو قبول کرلیا ہے، اس کے متعلق میں بہت تفصیل سے اپنے عربی مضامین میں لکھ چکا ہوں، ان کے ترجمے بھی ہوئے ہیں، میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا، لیکن اس وقت اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہی علم نافع اور آسمان سے اترا ہوا علم ہے، اس علم سے وابستہ ہے۔

اگر یہ ان لوگوں کو معلوم ہو جائے تو پھر وہ اِن مدارس کو، ممکن ہے کہ بہت سے مدارس کی انتظامی کمیٹیوں اوران کے سرپرستوں اوران کے رہنماؤں سے زیادہ، وہ ان مدارس کا قائم رہنا ضروری سمجھیں اوران کی حفاظت کریں، اور یہ آگ بجھانے والے انجن جو ہیں اوران کے جو مرکز ہیں، ان سے زیادہ ان مدارس کو اہمیت دیں، کہ ہوس کی آگ کو، نفس پرستی کی آگ کو، اور پھر دولت پرستی کی آگ کو (جو آخری چیز ہے) بجھانے والے یہی انجن ہو سکتے ہیں، ان انجنوں کی حفاظت کریں۔

مدارس نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ ملک کے لیے بھی ضروری ہیں

یہ بات میں نے ایک امت مسلمہ کے نقطۂ نظر سے اوراس کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی اوراس کا ربط بتاتے ہوئے بھی اوراس کے ساتھ ساتھ پورے ملک کی آبادی کا جہاں تک تعلق ہے، اس کا ان مدارس کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہونا چاہیے، تاثر ہونا چاہیے، اور فیصلہ ہونا چاہیے، اس کو بھی سامنے رکھ کر میں نے یہ بات کہہ دی کہ یہ مدارس نہ صرف مسلمانوں کے لیے ضروری ہیں بلکہ ملک کے لیے ضروری ہیں، وہاں کی آبادی کے لیے ضروری ہیں، وہاں کے مستقبل کے لیے ضروری ہیں، اگر وہ ملک آدمیوں کو دیکھنا چاہتا ہے کہ آدمی آدمی کی طرح رہے، آدمی بھیڑیا نہ بن جائے، آدمی کتا اور سانپ اور بچھو نہ بن جائے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس طرح کے مراکز چاہے اُن کا نام آپ مدارس رکھیے، چاہے ان کا نام آپ کچھ اور

رکھیے، کسی زبان میں رکھیے، لیکن بہر حال ایسے مرکزوں کی ضرورت ہے۔

میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اس ادارے کے خادم کی حیثیت سے، اپنی طرف سے بھی، اپنے رفقاء کی طرف سے بھی کہ خدا نے موقع دیا، اور شاید اس شر میں بھی ایک خیر ہو کہ اس نامناسب اور غیر عاقلانہ، غیر دانشمندانہ اقدام نے مدارس میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے، ان کو اپنی قیمت کا بھی احساس ہوا ہے، اور خطرے کا بھی احساس ہوا ہے، اور یہی دو چیزیں ہیں جو منفی و مثبت مل کر کے انھوں نے بڑے بڑے انقلابات کیے ہیں، کہ خطرے کا بھی احساس ہو اور اس کی حفاظت کے طریقے کی بھی تلاش ہو، اس کا بھی عزم ہو، تو پھر بہت بڑی رو بہ زوال سلطنتوں اور رو بہ زوال تہذیبوں کو بھی اس وقت زندگی کی ایک قسط مل گئی ہے۔

میں اس اجلاس کو مبارک سمجھتا ہوں، اور وقت کا ایک بڑا اہم فریضہ اور تقاضا سمجھتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اپنی طرف سے بھی اور آپ کی طرف سے بھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے یہاں تشریف لانے کو قبول فرمائے، یہاں آنے والوں کو اجر دے، اور یہاں جن لوگوں نے ان کو احترام سے دیکھا، اور ان کی خدمت کو اپنا شرف سمجھا، اللہ ان کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے، اور صرف یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء نہیں بلکہ ہمارے مدارس سے لے کر مکاتب تک جو چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں، اور اضلاع میں، مضافات میں، دیہاتوں میں ہیں، وہاں بھی ان سب کی حفاظت فرمائے، اور ہمیں بھی چاہیے کہ ہم یہاں سے یہ عزم لے کر کے نکلیں کہ ہمیں اس میں اور توسیع کرنی ہے، اور اس کی تعداد بڑھانی ہے، اور ہمارے دارالعلوم کے طلبہ اور فضلاء یہاں سے یہ عزم لے کر کے نکلیں کہ ہمیں مدارس قائم کرنے ہیں اور ان مدارس کو ترقی دینا ہے، اور اس کا کسی ایسے بڑے مدرسے سے ربط قائم کرنا ہے جہاں سے ان کو رہنمائی حاصل ہو سکے۔(۱)

---

(۱) نومبر ۱۹۹۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء پر پولیس چھاپہ اور فائرنگ کے واقعہ کے بعد ۰۵/جنوری ۱۹۹۵ء کو ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں منعقد 'تحفظ مدارس کنونشن' کے اختتامی اجلاس میں کی گئی تقریر، یہ تقریر اب قلمبند کرنے کے بعد شائع کی جارہی ہے۔

مدرسہ کیا ہے؟[۱]

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ، وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [سورۃ الجمعۃ:۲-۳]

میں نے آپ کے سامنے قرآن کریم کی جو آیت تلاوت کی، اس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ وہ ذات پاک جس نے ان پڑھوں میں سے ایک ذات عالی کو نبی بنا کر بھیجا، وہ اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سناتے ہیں، ویسی ہی جیسی جبرئیل امین سے سنی، یعنی وہی حروف، وہی نقطے، وہی اعراب، ابھی آپ کے سامنے قرآن پاک کی تلاوت ہوئی، اس سے بڑھ کر رکارڈ اور کیا ہوگا کہ جگن پور جیسے دور دراز مقام میں اللہ کا کلام اسی طرح پڑھا گیا جس طرح سننے والے پڑھتے تھے، اور اہل زبان پڑھتے ہیں، قرآن حکیم کے علاوہ کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں جو آج بھی اسی طرح پڑھی جاتی ہو جس طرح اس کا پیغمبر پڑھتا تھا، یہ دعوی اگر کوئی کرسکتا ہے تو صرف مسلمان کرسکتا ہے، دوسرے کو اس دعوے کی نہ ہمت ہے نہ شوق۔

مسلمان کے پاس غیروں جیسی حکومت، صنعت، حرفت، فوجی طاقت نہیں، لیکن ان کا رشتہ اللہ کے کلام کے ذریعہ اللہ سے اسی طرح قائم ہے، اور ایک معمولی فرد دوسروں کے مقابلہ میں کہہ سکتا ہے کہ میں اس امت کا فرد ہوں جو اللہ کے کلام کو اسی طرح پڑھ سکتی ہے جس طرح ۱۴ سو سال قبل اس کے پیغمبر پر نازل ہوا تھا۔

تزکیہ

﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ وہ ان کو پاک صاف کرتا ہے، مانجتا ہے، سنوارتا ہے، سجاتا ہے جیسے برتن مانجا جاتا ہے، دلوں کو، دماغوں کو اللہ کا پیغام دیتا ہے، رذائل اخلاق کو نکالتا ہے، اخلاق فاضلہ کو جماتا ہے، دل ودماغ میں اتارتا ہے، ان کا رنگ ان پر چڑھاتا ہے، ایسا نہیں کہ پڑھ کر سنا دیا اور ویسے کے ویسے ہی رہے، پتھر کو پتھر نہیں بلکہ ان کو آدمی بناتا ہے، ان کے اندر خشوع وخضوع پیدا کرتا ہے، ان کے اندر نفس کا احتساب کرنا، اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا، دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنا، اپنے، اپنی اولاد، اپنے ماں باپ کے خلاف حق کی گواہی دینا، ان جذبات کو ابھارتا ہے، کدورتوں کو نکالتا ہے، حسد کو دور کرتا ہے، کینہ پاس نہیں آتا، الفتیں پیدا کرتا ہے، محبتیں جاگزیں کرتا ہے، خود تکلیف اٹھانا، دوسروں کو آرام پہنچانا سکھلاتا ہے۔

تعلیم کتاب وحکمت

﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ وہ ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، کتاب یہی قرآن حکیم ہے، اور ''حکمۃ'' کے بارے میں بہت سے محدثوں کی رائے ہے کہ اس سے مراد حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

﴿وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ﴾ چاہے وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں۔

﴿وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو ابھی شامل نہیں ہوئے، انھوں نے ان کا زمانہ نہیں پایا، وہ بعد میں آنے والے ہیں، کتنے بعد میں؟ اس کی کوئی تشریح نہیں، پچاس برس، سو برس، پانچ سو برس، یا اس سے بھی زیادہ اس کی کوئی مدت نہیں بتائی گئی ہے، اس دنیا کی عمر بہت ہے، قیامت تک مسلمانوں کی جو نسل پیدا ہوگی وہ سب اسی میں شامل ہوگی۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ اور وہ غلبہ والا، طریقۂ کار والا ہے، اس لیے کہ اتنی بڑی بات کے لیے غلبہ بھی درکار ہے اور طریقۂ کار کی بھی ضرورت ہے۔

صحابہ کرامؓ

وہ صحابہ کرام جنھوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، آپ کا جمال جہاں آرا دیکھا، جن کو آپ (ﷺ) کے دیکھے اور آپ کی بات سنے بغیر چین نہیں آتا تھا، ان کے لیے ہم نے مانا کہ ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ان کے بارے میں تھا، لیکن وہ بعد میں آنے والے جنھوں نے نہ رسول (ﷺ) کو دیکھا اور نہ رسول نے ان کو دیکھا، ان کو بھی تعلیم وتزکیہ کا فیض پہنچے گا، اور منور کر دے گا، اس کا کیا طریقہ ہے؟ اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آتا ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا کہ ان لوگوں کو دیکھنا چاہو تو سلمان فارسی اور ان کی قوم کو دیکھو۔ سوچیے کہ جس کی زبان عربی نہیں اس کو نبوت کا فیض کیسے پہنچے گا؟ حالانکہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا کہ اگر علم ثریا پر ہوتا تیران کے کچھ لوگ اس کو ضرور پا لیتے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ بہت بڑے زبردست عالم ایرانی تھے، لیکن وہ ایرانی ہوں، افغانی ہوں، ترک ہوں، ہندوستانی ہوں، سب اسی خوان نبوت کے زلہ ربا ہیں، اس کی نعمتوں کا جو خوان بچھا دیا تھا ''إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللهُ يُعْطِي'' سب اسی کے ٹکڑے کھا رہے ہیں۔

کون ہے بڑے سے بڑا عالم جو یہ دعوی کرے کہ ہم اس کے ٹکڑے پر نہیں پلے، ہم سب اسی کے ٹکڑے پر پلے ہیں، اور آج بھی پل رہے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ ہم آج دنیا کے بڑے سے بڑے عالم کے سامنے آسکتے ہیں، ہمیں اس پر ناز ہے کہ ہم ان کے ٹکڑوں پر پلے ہیں۔

لیکن بعد کے لوگوں کو نبوت کا فیض کیسے پہنچا جنھوں نے نہ رسول اللہ (ﷺ) کی زیارت کی، نہ آپ (ﷺ) کی آواز سنی، نہ آپ کا زمانہ پایا، نہ وہ آپ کی زبان سمجھتے ہیں، پھر تلاوت، تعلیم کتاب، تزکیہ، تعلیم حکمت، ان چاروں سعادتوں میں حصہ ان کو کیسے ملے؟ کون سی چیز ان کو ان سے ملاتی ہے؟ زمانہ نہیں، زبان نہیں جو ملا سکے، یہی چیز ایک دوسرے کو ملاتی ہے مگر یہاں ان میں سے کچھ بھی نہیں، پھر بھی نبوت کا پہنچنا کیسے اور پہنچے گا کیسے؟ ہمارے کتب خانہ میں آیئے تو ہفتہ گزر جائے گا اور ان کتابوں کا شمار کرنا دشوار ہوگا جو ان اکابرین امت کے بارے میں لکھی گئی ہیں، جن کا نہ مقام ایک، نہ زمانہ ایک، نہ زبان ایک،

پھر ان کو یہ علم کیسے پہنچا اور یہ لوگ اس درجہ کو پہنچ کر اتنے بڑے عالم کیسے بن گئے؟

مدارس کا فیضان

یہ جن چیزوں کی بدولت ہوا وہ ہیں: عربی زبان، مدارس، عربی تعلیم، مدارس کا قیام، اساتذہ کا وجود اور اول و آخر توفیق الٰہی، اگر یہ نہ ہو تو بعد کی نسلوں کو خیر القرون سے اور نبوت و رسالت سے ملانے والی، آپؐ کے دامن سے چمٹانے اور قدموں سے لگانے والی کون سی چیز ہے؟ آج بھی قرآن کے لاکھوں حافظ اور دین کے لاکھوں ممتاز عالم موجود ہیں جو بخاری مسلم، ابوداؤد، ترمذی، بیضاوی، جلالین، ہدایہ کا درس دیتے ہیں، یہ کس بات کی کرامت ہے کہ ہندوستان میں بیٹھ کر عالم پیدا ہو رہے ہیں، اور ہر نسل میں پیدا ہوئے؟ یہ عربی تعلیم کا فیض، مدارس کا احسان اور اساتذہ کی برکت ہے جو اپنی بینائی اور صحت کی پرواہ کیے بغیر کتابوں کے کیڑے بن رہے ہیں، ہندوستان میں بہت سے ایسے فضلاء پیدا ہوئے جو عربی زبان میں عربوں سے بڑھ گئے، عربوں نے ان کا لوہا مانا اور ان کو استاذ مانا، بعض لوگوں نے یہاں تک کہا ہے کہ قرآن مجید عرب میں نازل ہوا، مغرب میں یاد کیا گیا، مصر میں پڑھا گیا، ترکی میں لکھا گیا، اور ہندوستان میں سمجھا گیا، بتائیے کہاں نازل ہوا یہ اور ہندوستان میں سمجھا گیا، یہ اسی خلوص، قربانی اور عزم و ارادہ کی پختگی کا فیض ہے کہ چودہ سو برس بعد بھی آج بھی قرآن و حدیث کا فیض جاری ہے، عالم پر عالم پیدا ہو رہے ہیں، اور ابھی بہت سے لوگ آئندہ آنے والے ہیں، یہ ان مدارس کا فیض ہے کہ اللہ نے ساری انسانیت کو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے جن کا سلسلہ قائم فرمایا۔

مدرسہ کا تعارف

بھائیو! مسلمانوں جیسی باہمت، صاحب دین، صاحب شریعت اور صاحب دعوت ملت کا تصور نہیں ہوسکتا، اور جب تک مسلمانوں اور خود عربوں کا بھی اس منبع علوم، مصدر علوم اور سرچشمۂ علوم کی ذات سے تعلق نہ ہو، اس وقت تک جزیرۃ العرب میں بھی مسلمان، مسلمان نہیں رہ سکتے۔

یہ مدرسہ کا مختصر تعارف ہے کہ یہ وہ واسطہ ہے جو مسلمانوں کو مرکزِ علم اور مرکزِ شریعت سے مربوط کرتا ہے، جس طرح بغیر پل کے دریا کو پار نہیں کر سکتے، اسی طریقے سے مرورِ زمانہ اور زبان کے اختلاف سے جو خلیج پڑ گئی ہے اس کو مدرسوں اور علوم اسلامیہ کے علاوہ کوئی دوسری چیز پاٹ نہیں سکتی۔

اس کے لیے آپ کو ہمت کرنی پڑے گی، مدارس آسمان سے نہیں اتریں گے، آپ کو اپنی کمائی کا حصہ نکالنا پڑے گا، قربانی کرنی پڑے گی، وقت دینا پڑے گا، جگن پور مدرسہ اسی لیے قائم ہوا ہے کہ اس دور دراز خطہ کے رہنے والوں کو شریعت سے جوڑ دے۔

اللہ نے مدارس کو ضروری قرار دیا ہے، فرض کے حصول کا ذریعہ فرض ہو جاتا ہے، علم دین کا حصول فرض ہے اور اس کا ذریعہ مدارس ہیں، اس لیے مدرسہ کا اہتمام فرض ہے، اگر یہ نہ ہوں گے تو ملت کا رشتہ شریعت سے ٹوٹ جائے گا، آپ کہیں گے: پھر کیا ہوگا؟ وبا پھیل جائے گی، یا پیسہ کم ہو جائے گا؟ میں کہتا ہوں کہ اگر مدارس نہ رہیں تو پیسہ بڑھ جائے گا، حرام و حلال کا سوال ہی نہ رہے گا، پیسہ ہر طرح سے آسکتا ہے مگر ملت کا رشتہ شریعت سے قائم نہ ہو سکے گا، اگر اس کی کچھ اہمیت ہے تو فکر کیجیے۔

ہمارا دین دوسروں کی طرح نہیں کہ علم آیا اور عقائد پر ضرب پڑی، دوسرے مذاہب کا معاملہ بالکل اسی طرح ہے، جیسے ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ مچھروں نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) سے شکایت کی کہ ہم کو ہوا بہت پریشان کرتی ہے، ہمیں چین سے رہنے نہیں دیتی۔ سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کہ تنہا مدعی کی بات سن کر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا ہوا کو بلایا جائے، چنانچہ جیسے ہی ہوا آئی مچھر غائب۔

اسی طرح بہت سے مذاہب ایسے ہیں کہ اگر ہوا آئی تو مچھر گئے، علم آیا تو مذہبی عقائد فنا، لیکن ہمارا دین ایسا ہے کہ جتنی ہوا آئے، جتنا علم آئے اتنا ہی مضبوط ہوگا، بہت سے مذاہب علم سے گھبراتے ہیں، ہمارے یہاں علم فرض ہے، اگر اس دین کو باقی رکھنا ہے تو علم حاصل کیجیے، اور یہ کہاں حاصل ہوگا؟ مدرسہ میں۔ آپ نے اتنی بڑی عمارت بنائی، لیکن استاذ اور طلبہ اس سے زیادہ ضروری ہیں، اس لیے جب آپ نے مدرسہ کو مان لیا ہے تو ضرور

یات کو بھی مانیے، ندوۃ العلماء آپ کے مدرسہ کو مانتا ہے اور قبول کرتا اور ہر طرح کی مدد کا یقین دلاتا ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کو نفسانیت سے بچائے اور ہمیں بھی اللہ تعالیٰ بچائے، ہمیں خدمت کی توفیق دے اور آپ کو فائدہ اٹھانے کی۔

اس طرح آج مدرسہ کا آغاز ہو گیا اور آپ کی تمنا بھی پوری ہوگئی کہ ہم لوگ آ گئے ، سارے طالبان علوم نبوت ایک ہی خاندان کے فرد ہیں، ہم سب اسی سلسلہ میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو قبول فرمائے۔ (۱)

---

(۱) مدرسۃ الایمان، جگن پور (فیض آباد) کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ اکتوبر ۱۹۸۳ء)۔

گاؤں اور دیہات کے عربی مدارس

میں نے سپاس نامہ سنا، مجھے اس سے ندامت بھی ہوئی اور خوشی بھی، ندامت اس لیے کہ مجھے نہ سپاسنامہ قبول کرنے کی عادت ہے اور نہ میں اس کا اہل ہوں، خوشی اس لیے کہ سپاسنامہ اپنی زبان، طرز تحریر، لکھنے والے کے خلوص، خیالات اور سوالات کے لحاظ سے کافی اہم ہے، تاہم مجھے یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ سپاسنامہ اس چھوٹی سی جگہ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، لیکن اس کے باوجود میں اپنے اس احساس کو چھپانا بھی نہیں چاہتا کہ ''اَدری'' جیسے شہر سے دور افتادہ گاؤں میں جہاں لکھنے پڑھنے کی سہولت بہت کم ہے، ایسے لوگ بھی ہیں جو اس طرح کے اونچے خیالات رکھتے ہیں اور عمدہ لکھتے ہیں۔

گاؤں کی پرسکون زندگی اپنی جگہ قابل رشک ہے، لیکن اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے ملک میں گاؤں کی حیثیت ایک نقطے سے زیادہ نہیں، خدانخواستہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں گاؤں کی اہمیت سے انکار کررہا ہوں، ہر شخص کو معلوم ہے کہ گاؤں اپنی جگہ اہم اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے مجموعہ یا ملک کی طاقت کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ اکائیاں عمدہ اور مضبوط ہوں، اکائیاں اگر طاقتور ہیں، خودشناس ہیں تو لازمی طور پر مجموعہ بھی طاقتور اور مضبوط ہوگا۔

محترم دوستو! مسلمانوں کی کثرت کے لحاظ سے ہمارا صوبہ (یوپی) ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے، خصوصاً اس ضلع اعظم گڑھ کی تو بڑی اہمیت ہے، اور اس کے ساتھ ملک وملت کی بڑی اہم اور ناقابل فراموش تاریخ وابستہ ہے، موجودہ اعظم گڑھ کی عمر ڈیڑھ سو برس برس سے زیادہ نہیں، مگر صرف ہمارے صوبے میں نہیں پورے ملک میں اس کو نمایاں عزت اور شہرت حاصل ہے، صرف اس لیے کہ اس خطہ سے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے جن کے فیوض اور برکات

سے پورے ملک نے فائدہ اٹھایا، ملامحمود کو سب جانتے ہیں وہ اسی ضلع کے رہنے والے تھے، جونپور، اعظم گڑھ کی کچھ خصوصیت ہی تو تھی جس کی وجہ سے یہ خطہ شیراز ہند کہلایا، ملا نظام الدین اسی ضلع کے ایک تحصیل گھوسی کے رہنے والے تھے، حضرت شاہ محمد ٹیلہ والے بھی اسی ضلع سے تعلق رکھتے تھے، جن کی علمی رہنمائی نے سارے ہندوستان کو ایک نئی زندگی دی، خدا کا شکر ہے اب بھی یہ سرزمین بنجر نہیں ہوئی، اب بھی یہاں بڑی اچھی صلاحیت کے لوگ موجود ہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر آپ حضرات ہمت و دلچسپی اور لگن کے ساتھ اپنے بچوں کی صحیح تربیت کریں تو آپ کا یہ گاؤں مسلمانوں کی بڑی خدمت انجام دے سکتا ہے، خدا کا شکر ہے آپ کے آس پاس بہت سے عربی مدرسے ہیں جن کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

عربی مدارس اور ترقی کا جذبہ

مجھے اس وقت جو بات کہنی ہے وہ یہ کہ عربی مدارس میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ترقی کریں، اور ان میں ہر قسم کے علوم وفنون کی تعلیم ہو، یہ جذبہ نیک ہے، لیکن گاؤں کے مدارس کے لیے مفید نہیں ہوسکتا ہے، عربی یا فارسی کی انتہائی تعلیم کی وجہ سے گاؤں کسی قدر مشہور ہو جائے، لیکن مجموعی حیثیت سے اس طرح کی کوششیں اپنے اندر کوئی مفید پہلو نہیں رکھتیں۔

پہلے کا وہ دستور صحیح تھا کہ چھوٹی چھوٹی جگہوں پر طلبہ میں صرف ابتدائی تعلیم کی صلاحیت پیدا کی جاتی تھی، مگر یہ تعلیم ایسی ہوتی تھی کہ مدارس کو ان کی وجہ سے کافی شہرت حاصل ہو جاتی تھی، یہاں سے جانے کے بعد طالب علم بڑے مدارس میں اساتذہ سے پورا فیض حاصل کرتے تھے، اور اپنی ٹھوس ابتدائی تعلیم کی بدولت وہ بہت آگے بڑھ جاتے تھے، اس سلسلے میں تو بعض مدارس کو اتنی شہرت حاصل تھی کہ بڑے مدارس کے اساتذہ یہ جان کر ہی اطمینان کر لیتے تھے کہ یہ طالب علم فلاں مدرسہ سے آیا ہے۔

افسوس ان ادھر زیادہ دنوں سے یہ حالت باقی نہیں رہی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اب ہر گاؤں کے مدارس انتہائی تعلیم کے نظم واہتمام کے باعث ابتدائی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دے پاتے، جس کا اثر نہ صرف مدرسہ کی کارکردگی پر پڑ رہا ہے بلکہ طلبہ بھی اس کی وجہ سے کافی متاثر ہو رہے ہیں۔

گاؤں اور دیہاتوں نے ہی مرکز کو تازہ خون عطا کیا

اپنے ملک کی تاریخ سے آپ بڑی حد تک واقف ہیں، یہاں جب بھی اسلامی تہذیب، اسلامی علوم یا حکومت و سلطنت میں کوئی اضمحلال پیدا ہوا ہے، تو گاؤں اور دیہاتوں سے تازہ خون آیا، ایک شخص قصبہ سے اٹھ کر مرکز میں آیا، خواہ وہ مرکز لاہور ہو، دہلی ہو، پنجاب ہو، الغرض آپ ہر جگہ دیکھیں گے کہ کسی گاؤں کا صاحب دماغ انسان آکر مرکز میں پڑ گیا اور اس کی وجہ سے پورے ملک اور پورے نظام میں ایک نیا جوش، نیا عزم اور نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ افسوس ہمارے گاؤں عرصہ سے اس قسم کے انقلابی انسان پیدا کرنے سے قاصر ہیں، جس کی وجہ سے پورا ملک متاثر ہو رہا ہے۔

حضرات! آپ اپنی آبادی کو حقیر نہ سمجھیں، اس کی بڑی اہمیت ہے، یہاں ایسی فضا پیدا کیجیے کہ بچوں میں پختگی پیدا ہو، تاکہ وہ مرکزی مدارس میں جائیں تو ان کے اندر بڑے مرکز کا مقابلہ کرنے کی قوت اور طاقت پیدا ہو، اور وہ بعد کے تکمیلی مدارج اطمینان سے طے کر سکیں۔

ملک وملت کو آج تازہ خون کی ضرورت ہے

آپ کا یہ مدرسہ ''دارالعلوم'' بڑی اہمیت کا حامل ہے، آپ یہاں بچوں کی ایسی تربیت کیجیے کہ وہ ملک وملت کی خدمت انجام دے سکیں، میں یہ نہیں کہتا کہ آپ یہاں خانقاہ بنائیے، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ یہاں ایسے اساتذہ ہوں جو طلبہ میں دین کا صحیح ذوق پیدا کر سکیں، دینی علوم وفنون سے ان میں دلچسپی پیدا کریں، اور اس طرح ان کو یہ بتائیں کہ یہ مدرسہ بہت کچھ ہے، یہ آبادی حقیر نہیں، اور یہ دارالعلوم ایک اچھی تربیت گاہ ہے، قبل از وقت بچوں میں باہر جانے کا شوق پیدا کر دینا ٹھیک نہیں، اساتذہ بچوں کو اپنی کمائی سمجھیں، اور ان کی اس ڈھنگ پر تربیت کریں کہ وہ ملک میں اسلامی تہذیب کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ میں زندگی کا نیا تیل ڈال سکیں، ملک وملت کو آج خون کی ضرورت ہے، مگر ایسا خون جو ابلتا ہوا، جوش مارتا ہوا، رگوں میں دوڑنے کے لیے بیتاب ہو، یقین مانیے اب شہروں میں یہ خون پیدا نہیں ہو سکتا، لے دے کر دیہاتوں ہی سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے، یہیں کی فضا کسی قدر سازگار ہے۔

میں سپاسنامے سے بہت متاثر ہوں، جہاں ایسے نوجوان ہوں جو اس طرح کے خیالات اور اس طرح کی تحریر لکھ سکتے ہوں، وہاں تعلیم کا معیار بھی بہت بلند ہونا چاہیے۔ سپاسنامہ لکھنے والے کو میں مبارکباد دیتا ہوں، لیکن ان سے میری گزارش ہے کہ وہ اپنے موضوع کو اس سے زیادہ مفید بنائیں، اسلامی مقاصد پر اپنی صلاحیت کو استعمال کریں، اور کسی بڑے مقصد کے لیے کسی اہم موضوع پر اپنے آپ کو وقف کریں۔

سپاسنامے میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں، میری تازہ تصنیف "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" قریب قریب اسی موضوع پر ہے، جس میں آپ کو اپنے بہت سارے سوالات کا جواب مل سکتا ہے، میں انشاء اللہ اسے یہاں بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ "تعمیر حیات" آپ کے یہاں مانوس ہے اور آپ حضرات کے مضامین بھی اس میں آتے رہتے ہیں، میں آپ حضرات کی عزت افزائی کے لیے شکر گزار ہوں، انشاء اللہ جس قدر بھی آپ لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں کروں گا، اس وقت کا آنا بالکل اتفاقی امر ہے، مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ میں یہاں تک پہنچ سکوں گا، انشاء اللہ اگر کبھی آنا ہوا تو دعا ہے کہ دار العلوم کو اس سے بہتر شکل میں عمارت کے لحاظ سے نہیں، تعلیم و تربیت کے لحاظ سے دیکھ سکوں، میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ حضرات دو ایک مضامین پر طلبہ کو خاص طور پر تیار کریں، اور ان کے ذہن کو پختہ کریں، یہی بچے کل ہماری جگہ ہوں گے اور انشاء اللہ ملک و ملت کی بڑی خدمت انجام دیں گے، خدا انھیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔

رضائے الٰہی

اصل چیز ہے رضائے الٰہی، اگر یہ چیز مطلوب ہے تو انشاء اللہ ہماری مدد کی جائے گی۔

بچپن میں ہم نے ایک قصہ پڑھا تھا کہ ایک قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا، تمام جنگی تدابیر ناکام ہو چکی تھیں، اسی دوران رات میں ایک روز ہوا اور پانی کا زبردست طوفان آتا ہے جس سے تمام لشکر تتر بتر ہو کر رہ جاتا ہے، مگر اسی عالم میں لشکر میں ایک ایسا درویش بھی ہے جس کے جھونپڑے کا چراغ گل نہیں ہوا ہے، لوگوں نے درویش سے درخواست کی، انھوں نے دعا کی اور قلعہ فتح ہو گیا۔

میں سمجھتا ہوں یہ قصہ صحیح بھی ہوسکتا ہے، اس سے ایک بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ رضائے الٰہی کا چراغ طوفان میں بھی جلے گا، اس میں وہ تیل اور وہ لَو ہے جو کبھی بجھ نہیں سکتی، ذات باری کے سامنے سارا جہاں سرنگوں ہے، حقیقتاً اگر نورِ حق سے تعلق پیدا ہو گیا تو پھر بقائے دوام میں کوئی شبہہ نہیں، ورنہ دورِ حاضر کی تند و تیز آندھی میں صرف مادی اسباب و وسائل سے کسی چراغ کا جلتا رہنا بڑا دشوار ہے، یاد رکھیے، اگر اللہ سے صحیح تعلق پیدا نہیں ہوسکتا، تو پھر کوئی چراغ نہیں جل سکتا، مجھے آپ حضرات سے مل کر اور آپ کی اس زندہ کوشش (دارالعلوم) کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، خدا اس کو بارآور کرے اور قبول فرمائے۔ آمین!!(۱)

---

(۱) دارالسلام، ادری (ضلع مئو) میں کی گئی تقریر، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/ مارچ ۱۹۶۵ء)۔

مدرسہ ومسجد-لازم وملزوم

حضرات! میں اپنی اور اپنے سب ساتھیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ مجھے خوشی ہے کہ ہم اس مدرسے میں آئے، اور ہم نے اس کو دیکھا، اور تفصیلات معلوم ہوئیں، نہ صرف یہ کہ مسجد اور مدرسہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بلکہ مدرسہ اسلام میں مسجد ہی سے شروع ہوا ہے، اور ''صفہ'' اردو میں ہم اس کو چبوترہ کہیں گے، وہ مسجد نبوی میں ایک جگہ تھی جہاں ایسے لوگ بیٹھے رہا کرتے تھے جو خاص طور پر دینی معلومات حاصل کرتے تھے، اور قرآن مجید سنتے تھے، یاد کرتے تھے، اور انھوں نے اپنی زندگی اس لیے وقف کردی تھی، ان کو ''اصحابِ صُفہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور صحابہ کرامؓ میں بھی خاص علمی امتیاز رکھتے ہیں۔ آپ میں سے بہت لوگوں نے حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کا نام سنا ہوگا جو حدیث کے مشہور راوی ہیں، اور جن کی روایات تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہیں، وہ بھی انھیں صحابی طالب علموں میں تھے جو اللہ پر توکل کیے ہوئے وہاں پڑے رہتے تھے اور آنحضور (ﷺ) جو کچھ فرماتے اس کو غور سے سنتے اور یاد رکھتے تھے، پھر اس کے بعد جب بڑی بڑی مسجدیں بننے لگیں تو بڑے بڑے مدرسے بھی ان میں قائم ہونے لگے۔

اسلام کی تاریخ میں جو چوٹی کے مدرسے دنیا میں مشہور ہیں، وہ مسجدوں ہی کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً سب سے قدیم درسگاہ جس میں کچھ اختلاف ہے، جامعہ ازہر یا جامعہ قروین ہے، یا جامعہ زیتونہ، میں نے تو تونس کے عالموں سے سنا ہے، سب سے قدیم جامعہ زیتونہ ہے، جامعہ کے معنی عربی میں جمعہ مسجد کے ہیں، جس کو آپ جامع مسجد کہتے ہیں، تو وہ جامعہ زیتونہ بعد میں ہوا، لیکن جامع زیتونہ پہلے وجود میں آئی، یعنی مسجد پہلے بنی پھر اس میں

مدرسہ قائم ہوا، جو جامعہ زیتونہ کہلایا، ایسے ہی مسجد القرویین، فاس میں جو مراکش کا سب سے بڑا علمی شہر ہے، علمی و دینی مرکز ہے، وہاں جامع القرویین یا مسجد القرویین کے نام سے ایک مسجد ہے، میں نے زیارت کی ہے، وہاں وہ مدرسہ قائم ہوا جس میں بڑے بڑے ائمہ فن اور اور بڑے بڑے کامل الفن استاد، مصنف، فقیہ، ادیب اور مؤرخ پیدا ہوئے، اور جامعہ ازہر کو تو دنیا میں جو شہرت حاصل ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس وقت سب سے بڑی مسلمانوں کی دینی یونیورسٹی جامعہ ازہر ہے، جامعہ ازہر اصل میں جامع الازہر کے نام سے ایک مسجد ہے، جو اب بھی موجود ہے، وہاں تعلیم ہوتی تھی، لیکن جب وہ مسجد ناکافی ثابت ہوئی تو اس کے بعض شعبے باہر قائم کیے گئے اور ان کے لیے عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

اصل میں مدرسہ اور مسجد یہ دونوں لازم وملزوم ہیں، جب مسجد بڑی ہو تو مدرسہ ہونا بھی ضروری ہے، خواہ اس کے صحن میں ہو یا اس کے آغوش میں ہو، خواہ اس کے پہلو میں ہو، دونوں کا اس سے تعلق ظاہر ہوتا ہے، اور اسی طرح عیسائیوں میں بھی جو بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہیں، وہ ان کے کلیساؤں سے شروع ہوئی ہیں، سوبورن یونیورسٹی جو پیرس کی یونیورسٹی ہے، وہ ایک گرجا گھر سے شروع ہوئی ہے، ایسی ہی اور ہندوستان کی بہت سی یونیورسٹیاں!

ایک حقیقت تو یہ ہے، اور ایک حقیقت ہمارے اور آپ کے سامنے ہے کہ یہاں کی جامع مسجد، تاریخی شاندار جامع مسجد کے پہلو میں اور اس کے زیر سایہ یہ مدرسہ قائم ہے، بلکہ مسجد ہی کے گویا گود میں ہے۔

اردو زبان، دینیات اور جدید تعلیم

دوسری بات یہ ہے کہ میں یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ نے یہاں جو مدرسہ قائم کیا، اس میں آپ نے ہندی زبان کو بھی رکھا ہے، اور آپ یہ کوشش کرتے ہیں کہ مثلاً آپ کا بچہ پانچواں پاس کر کے چھٹے میں داخلہ لینا چاہے تو اس کو کوئی دشواری محسوس نہ ہو، اور آسانی کے ساتھ اسے داخلہ مل جائے، آپ صحیح نتیجے تک پہنچے، ہندوستان میں حالات جو تیزی سے بدل

رہے ہیں اور یہاں اسلامی خصوصیات قائم رکھنے کا جو مسئلہ درپیش ہے، اس کا یہ حل ہے کہ ہم ایسے مدارس قائم کریں جہاں ایک طرف دینیات کی تعلیم کا پورا اہتمام ہو اور محض لوگوں کو دکھانے کے لیے، چندہ حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ واقعی جو اچھے سے اچھا انتظام ہو سکتا ہے ایمانداری کے ساتھ، سنجیدگی کے ساتھ اس کا انتظام کیا جائے کہ دینیات کی اچھی تعلیم ہو، اچھی کتابوں کے ذریعے تعلیم ہو، اچھے استادوں کے ذریعے تعلیم ہو، اور بچے اردو سے بھی آشنا ہو جائیں، اردو بہت ضروری ہے ہندوستان کی تمام ریاستوں کے مسلمانوں کے لیے، اسی سے ہمارا رابطہ قائم ہوتا ہے، اسی سے اسلامی تہذیب جو ہندوستان میں پنپی اور پھلی پھولی اور اس ذخیرے سے جو ہندوستان کے علماء نے یہاں پیدا کیا اور جو بہت کم ملکوں میں ایسا پایا جاتا ہے۔

معیاری نرسری اسکول کا قیام

مانٹیسری اسکول (Montessori School)، نرسری اسکول (Nursery School)، کنڈرگارڈن (Kindergarten School) وغیرہ قسم کے مدارس نہایت ضروری ہو گئے ہیں، ہم جس وقت سفر پر روانہ ہوئے تھے تو اس وقت ہی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ہم مسلمانوں کو توجہ دلائیں گے کہ اب صرف کنویں بنانا اور صرف مسجد کے مقابلے میں مسجد بنانا (مسجد بنانا تو سب سے افضل عمل ہے) لیکن جہاں مسجد کی ضرورت نہ ہو وہاں بے ضرورت مسجد بنا دینا یہ بعض اوقات ''مسجد ضرار'' ثابت ہوتی ہے، اور مسلمانوں میں انتشار پیدا کرتی ہے، تو صرف یہی ایک نیکی کا کام نہیں ہے، بلکہ بڑی نیکی کا کام یہ ہے کہ آپ اس نئی نسل کو بچائیں اور ایسے معیاری اسکول قائم کریں جن کا انتظام، جن کے اساتذہ کی سطح، یعنی کوالیفیکیشن (Qualification)، ان کا تجربہ کسی طرح سے دوسرے اسکولوں سے کم نہ ہوں جس کو دوسرے فرقوں نے قائم کیے ہیں، بلکہ بہتر ہونا چاہیے، مسلمانوں کو ہر میدان میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور پھر اس کا ڈسپلن، رکھ رکھاؤ، اس کی صفائی اور اس کا نظم و نسق وہ ہر طرح سے ایسا ہو کہ کھاتے پیتے لوگ اور جن کا معیار زندگی بلند ہے، وہ اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے میں ذرا بھی تأمل نہ کریں۔

آپ سب جانتے ہیں کہ میں مدرسہ کا آدمی ہوں، اب بھی مدرسہ ہی کا خادم ہوں، اور عربی مدارس کی دعوت دیتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ میں ہی آپ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اب آپ زمانے کو سمجھئے، زمانے کے تیور سمجھئے اور اب آپ ہر جگہ ایسے اسکول قائم کیجیے جہاں اچھے، خوشحال اور تعلیم یافتہ لوگ اپنے بچوں کو بے تکلف بھیجیں۔ آپ یہ امید نہ رکھیں کہ سب عربی مدارس میں آجائیں گے، ہوجاتا تو بڑا اچھا تھا، لیکن ہر تمنا پوری نہیں ہوتی ہے، اس کا ہمیں لحاظ رکھنا چاہیے کہ ایسا نہیں ہوسکے گا۔ بہت لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دینیات سے تو بچے واقف ہوجائیں لیکن اس کے بعد ہندوستان کی جو عام تعلیم اور مشترک نصاب ہے، جس کے بغیر نوکری نہیں مل سکتی، جس کے بغیر آدمی کاروبار بھی نہیں کرسکتا، تو اس میں بھیجنا بہت ضروری ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے بچے دین سے واقف ہوجائیں، اردو سے واقف ہوجائیں، اس کے بعد پھر اس لائن پر چلیں، وہ کچھ غلط نہیں سمجھتے، زمانے نے ان کو مجبور کیا ہے، یہ کوئی گناہ کی بات نہیں، ان کے لیے ایسے اسکولوں کو قائم کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے کہ جہاں بقدر ضرورت دینیات سے واقفیت ہوجائے، نماز اور روزے کے پابند ہوجائیں، اردو پڑھ لکھ سکیں اور اسلام کی خوبی کا نقش ان پر قائم ہوجائے، وہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر کریں، اور اس کی کوشش کریں کہ مسلمان رہیں اور پھر دوسرے یہ بھی ایک نظام ہی ہے کہ ان میں وہ نہ صرف یہ کہ اُن کے برابر تیار ہوں جو غیر مسلم اسکولوں میں پڑھتے ہیں، بلکہ آپ کا تعلیمی نتیجہ اُن سے بہتر ہونا چاہیے، آپ کے بچے جب وہاں جائیں چھٹے میں یا اوپر ہائی اسکول وغیرہ میں داخل ہوں تو وہ اُن کے مقابلہ میں بہتر ہوں، اگر آپ اس میں کامیاب ہوگئے تو بڑی خدمت انجام دیں گے، اور کبھی یہ نہ سمجھئے گا کہ آپ کوئی غلط کام کررہے ہیں، کوئی صاحب اگر آپ کو اس میں وسوسہ پیدا کردیں کہ میاں! کہاں کس جھنجھٹ میں پڑے ہو، سیدھے سیدھے ایک سرائے بناؤ جہاں مسافر ٹھہریں، یا کسی لنگر کا انتظام کرو، یا مسجد میں ایک اور منارہ بنادو، دو منارے ہیں، اس میں ایک اور مینارہ بن جائے، تو آپ کبھی ایسے آدمیوں کی بات میں نہ آیئے گا، ہم لوگ بھی دین کا تھوڑا بہت علم رکھتے ہیں، خدا کے فضل سے دینی مدارس ہی کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اور بس چلے تو

آپ سب بھی اس کے لیے مدد کریں اور اپیل کریں، لیکن آپ جو کام کر رہے ہیں اس کو ہم سراہتے ہیں، ہم اس کی قدر کرتے ہیں اور ہم خود اس کی ضرورت سمجھتے ہیں، چاہے عربی کی کوئی یونیورسٹی قائم ہو جائے اور ہو رہی ہے مثلاً اندور میں، وہ آپ سے دور ہی کتنا ہے، وہ اپنی جگہ پر، یہاں بھی کل مدرسہ کے سلسلے میں بات چیت ہوئی، ٹھیک ہے وہ قائم ہو اور اللہ اس کو ترقی دے، مگر ایسے اسکولوں کی ضرورت باقی رہے گی۔

مسجد کے زیر سایہ اسکول

آپ نے اسکول کو مدرسہ کے ساتھ رکھا ہے، بہت اچھا کیا ہے، یہاں بچے نماز کے منظر کو دیکھیں گے تو چاہے وہ کتنی ہی ترقی کر جائیں، وہ ڈاکٹر ذاکر حسین بن جائیں یا فخر الدین بن جائیں، ان کو یاد رہے کہ نماز میں کیا کشش ہے، اور ان کو جو سیکھا ہوا سبق ہے بچپن کا، وہ یاد آئے کہ ہم نے وہاں ایسی باتیں سنی تھیں، وہاں ہم نے ایسے اللہ کے نیک بندوں کے واقعات سنے تھے، اولیاء اللہ کے، صحابہ کرامؓ کی سیرت کی باتیں ان کے کان میں پڑیں اور آپ وقتاً فوقتاً اس کا انتظام بھی کرتے رہیں، یہ نہ سمجھیں کہ یہ بچے ناسمجھ ہیں، ان کو کیا یاد رہے گا، نہیں! ان کو خوب یاد رہتا ہے، بچوں کو بچپن کی باتیں خوب یاد رہتی ہیں، اور بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ چاہے ان کے اوپر جتنا بھی پانی پھیرا جائے مٹتی نہیں ہیں، بہت سے لوگوں نے بتایا کہ بچپن میں ایک بات سنی تھی، وہ اب تک یاد ہے، اور وہی ہم کو روکتی رہتی ہے بہت سی برائیوں سے، اس لیے یہ کام بہت قابل قدر ہے۔

میں دینی تعلیمی کونسل یوپی کا صدر بھی ہوں اور اس کے ایک بہت ایکٹیو، سرگرم ممبر اور ایک عہدہ دار ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی بھی یہاں موجود ہیں، ہم اس کام کی تبلیغ کرتے ہیں، اس کے لیے دورہ کرتے ہیں، کانفرنسیں بلاتے ہیں کہ کیسے اسکول قائم ہوں؟

اساتذہ کی ذمہ داری

ایک بات استادوں سے کہنا چاہتا ہوں اور استانیوں سے بھی اگر میری بات ان کے

کام تک پہنچ سکے، کہ آپ سب سے زیادہ اثر اپنے ایمان سے ڈال سکتے ہیں، جب بچے آپ کا ایمان دیکھیں گے، آپ کی ایمانی کیفیت دیکھیں گے، نمازوں کی پابندی دیکھیں گے، آپ کا خوف خدا، آپ کی شرافت، آپ کا اخلاق اور آپ کی محبت جوان بچوں کے ساتھ ہوگی، اور اللہ و رسول کا نام جب آپ اس طرح لیں گے کہ جیسے منھ میں پانی بھر آیا، جیسے کوئی میٹھی چیز منھ میں ہے، یہ شیرینی اُن کو کبھی نہ بھولے گی، ہزار منطق کی دلیلیں ایک طرف اور اللہ کا نام جو آپ ادب سے لیں گے اور اللہ اور رسول (ﷺ) کا نام جو آپ محبت سے لیں گے، یہ بچہ کبھی نہ بھولے گا، ممکن ہے پڑھی ہوئی کتاب بھول جائے مگر وہ جو آپ کی زبان سے اللہ اور اس کے رسول کا نام سنے گا وہ اس کے دل پر ہمیشہ اثر کرتا رہے گا، اور بڑے بڑے فتنوں سے بچالے گا، یہ امریکہ جائیں گے، یورپ جائیں گے، اور وہاں کی یونیورسٹی میں پڑھیں گے، مگر اللہ اور اس کے رسول کی محبت آپ نے ان کے دل میں بٹھادی ہے، انشاء اللہ وہ وہاں بھی ان کو بہت سی خرابیوں سے بچالے گی، اس لیے آپ کا نمونہ اور خود آپ کے اندر جو خدا اور اس کے رسول کی محبت اور ادب ہے، وہ ان پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوگی، بہت سے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ ہمیں اپنے استاد کی فلاں بات نے متأثر کیا۔

ڈاکٹر اقبالؔ کہتے ہیں، جن کی دعا آپ نے ابھی بچوں سے پڑھوائی، سید میر حسنؔ ان کو ایک استاد مل گئے، ان کے اوپر ساری عمر ان کا اثر رہا، پھر ان کو آرنلڈ بھی ملے، اور پھر کیمبرج کے بڑے بڑے پروفیسر بھی ملے، اور میونخ کے بڑے بڑے محقق بھی ملے، لیکن میر حسنؔ صاحب کا جو اثر ان کے اوپر تھا، وہ اخیر تک رہا، اور سید میر حسنؔ صاحب سے بھی گویا ان کے دل میں اسلام کی عزت اور اسلامی علوم کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، ہر موقع پر ڈاکٹر اقبالؔ کسی نہ کسی تقریب میں اپنے استاد کا ذکر ضرور کرتے تھے، معلوم ہوتا تھا بہت گہرا اثر ہے۔

یہ بات تجربہ کی میں آپ سے کہتا ہوں، سب پڑھایئے، اچھی طرح پڑھایئے، لیکن آپ کا جو بولنے کا انداز ہے، آپ کی محبت ہے، آپ کی مسکراہٹ ہے اور اللہ و رسول (ﷺ) کا نام ادب سے لینا، مثلاً فرض کیجیے کسی موقع پر اللہ کا نام لیا جارہا ہو اور وہاں کوئی بچہ ہو جس سے آپ کہیں بیٹا! خدا کا نام لو، خدا کا نام لو، ادب کرنا چاہیے، ادب کرنا چاہیے،

وہ قرآن شریف کا ادب سیکھیں، کتابوں کا ادب سیکھیں، میں یہ بھی کہوں گا کہ مذہبی لوگوں کا اور عالموں کا بھی ادب کرنا سیکھیں، اس سے ان کو بڑا فائدہ ہوگا، علمِ دین کا ادب، پھر علمِ دین کا جو بھی نمائندہ ہے اس کا تھوڑا بہت ادب اور اس کی دل میں محبت، اس سے بھی اُن کو بڑا فائدہ پہنچے گا، علمِ دین کا مذاق نہیں اڑائیں گے۔

بس انھیں چند باتوں پر اپنی بات ختم کرتا ہوں، آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ ایک اچھا کام کر رہے ہیں، اور ہم میں سے اپنی قسمت سے اس کے بعد جو کبھی آئے خدا کرے وہ دیکھے کہ یہ باغ پھل پھول گیا، اور اس وقت جو یہ آپ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بہت چھوٹے سے پیمانہ پر ہے، بڑے پیمانہ پر ہو۔ (۱)

---

(۱) ۵/دسمبر ۱۹۷۷ء کو جامعہ اسلامیہ اسکول، (اُجّین) میں کی گئی ایک تقریر، ماخوذ از ''تحفۂ انسانیت''، صفحہ ۸۰ تا ۸۸۔